عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

مارچ ۱۹۳۹

ایک روپیہ

مرتب
محمد یونس

طلوع اسلام

کراچی

بدل اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
[illegible]

جلد ۲ — کراچی ...... مارچ ۱۹۴۹ء — نمبر ۳

فہرست

۱	لمعات		۱ — ۱۱
۲	مؤتمر عالم اسلامی	جناب پرویز صاحب	۱۲ - ۱۵
۳	یوم اقبال		۱۶
۴	رفتار عالم		۱۷ - ۲۴ ، ۴۶ - ۴۷
۵	تعارف معارف القرآن		۲۵ - ۳۵
۶	معاملاتِ پاکستان (صوبہ سرحد)	جناب "حق شناس"	۳۶ - ۴۶
۷	ایک اہم سوال		۴۷ - ۴۹
۸	باب المراسلات (ترکہ اور وصیت)		۵۰ - ۵۴
۹	نقد و نظر (اسلامی قانون)		۵۵ - ۵۶
۱۰	حقائق و عبر		۵۷ - ۶۱
۱۱	معجزات کی دنیا	جناب قریشی	۶۲ - ۶۷
۱۲	اسلامی حکومت		۶۸ - ۶۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قارئین طلوع اسلام اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جن حضرات کو پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے تصور سے اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، محترم چودہری خلیق الزماں صاحب ان میں نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے مئی سنہ ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا تھا کہ

> پاکستان میں قوانینِ شریعت، بالخصوص شرعی حدود کے نفاذ کا وقت ابھی نہیں آیا۔ یہ تعزیری قوانین اس وقت تک نافذ نہیں کئے جاسکتے جب تک مسلمان اپنی اصلاح کر کے سچے معنوں میں مسلمان نہ بن جائیں۔ جس ملک میں کامل متقی اور پرہیزگار لوگ نہ بستے ہوں وہاں ایسے قوانین کا نافذ کر دینا جن کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے یا زانی کو سنگسار کر دیا جائے، بڑا خطرناک ہے۔

اس کے بعد ۱۶ر جون سنہ ۱۹۴۸ء کو کراچی میں ایک دعوتی اجتماع کے موقعہ پر چودھری صاحب نے اس سوال کے جواب میں کہ "مسلم لیگ نے حصولِ پاکستان سے پیشتر قوانینِ شریعت کے نفاذ کا جو وعدہ کیا تھا، وہ اسے اب پورا کیوں نہیں کر رہی" فرمایا:-

> مسلم لیگ نے باضابطہ کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا۔ اس کا نصب العین حصولِ پاکستان تھا تاکہ مسلم اکثریت کے صوبے ہندوؤں کے تغلب سے آزاد ہو جائیں۔

ایک اور صاحب کے سوال کے جواب میں چودہری صاحب نے فرمایا تھا کہ

> یہ علماء کا کام ہے کہ وہ ایسے مساعد حالات پیدا کریں جن میں قوانینِ شریعت کا نفاذ مؤثر طریق پر ہو سکے۔ انھیں چاہئے کہ وہ ایک ایسی مہم شروع کریں جس سے لوگوں کی اخلاقی سطح بلند ہو جائے۔

پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ

> آج آپ کے کتنے فرقے ہیں۔ یہ تمام فرقے باہمی اختلاف رکھتے ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ان اختلافات کو نظر انداز کر کے کسی ایک فرقہ کو اختیار دیدیا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں ایسی درمیانی راہ نکالنی ہے۔ ہم اس وقت کسی قسم کا اختلاف برداشت نہیں کر سکتے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ شریعت کے قوانین کا نفاذ تدریجاً ہو سکتا ہے۔

ایک ساتھ ہی شریعت کے قوانین کا نفاذ ممکن نہیں۔

اور آخر میں یہ بھی کہ

شریعت اسلامی ہماری منزلِ مقصود ہے اور پاکستان کا قیام اسی لئے عمل میں آیا ہے۔

چوہدری صاحب کے ارشادات پر طلوعِ اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے اس لئے اس وقت ان پر کسی مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ ان بیانات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ چوہدری صاحب کے نزدیک

(۱) مسلم لیگ نے پاکستان میں قوانینِ شریعت کے نفاذ کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

(۲) قوانینِ شریعت کے نفاذ کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایسی فضا تیار کی جائے جس میں یہ قوانین نفاذ پذیر ہو سکیں۔

(۳) مختلف فرقوں میں کوئی درمیانی راہ پیدا کی جائے تاکہ اسلامی نظام سب کیلئے قابلِ قبول ہو سکے

(۴) نظامِ شریعت تدریجاً نافذ کیا جا سکتا ہے۔

(۵) شریعت اسلامی ہماری منزلِ مقصود ہے اور پاکستان اسی کے لئے عمل میں آیا ہے۔

یعنی پاکستان کا تو وجود ہی اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے عمل میں آیا ہے لیکن یہ نظام تدریجاً نافذ کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے پہلے مساعد فضا تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ بالفاظِ دیگر، پاکستان میں اسلامی نظام کی تنفیذ کے لئے ان دو شرطوں کی ضرورت ہے۔

(۱) یہ نفاذ تدریجی ہو اور

(۲) اس کے لئے پہلے فضا تیار کی جائے۔

اب آگے بڑھئے۔ ۹ فروری ۱۹۴۹ء کے اخبار ڈان میں چوہدری صاحب کا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "قرآنی یا اسلامی مملکت کے متعلق میرا تصور" اس مضمون میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مملکت کے اسلامی ہونے کے لئے یہ شرط لاینفک ہے کہ

> یہ مملکت تمام ملتِ اسلامیہ کی واحد مملکت ہو نہ کہ کسی نسلی یا جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے مسلمانوں کی مملکت۔ قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے نقطۂ ماسکہ (تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے لئے) ایک مرکز کا قیام ہے۔ اگر مسلمانوں کی موجودہ حکومتوں کو اس اصول پر پرکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان میں عالمگیریت اور مرکزیت کی یہ بنیادی شرط ہی مفقود ہے۔
>
> ایسے لوگ موجود ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے، اور وہ اسے اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، کہ اگر مسلمانوں کی کوئی ایک مملکت جو کسی ایک حصۂ ملک میں محدود ہو اور وہاں ان کی اکثریت ہو اس امر کا اعلان کر دے کہ وہ اس حصۂ ملک میں حکومتِ خداوندی قائم کرنا چاہتی ہے اور اسلامی قوانینِ شریعت کا نفاذ۔ تو اس سے وہ مملکت "قرآنی مملکت" بن جائے گی۔ یہ غلط ہے۔ قرآنی

مملکت کسی ایک حصۂ ملک میں قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام ملتِ اسلامیہ کی واحد مملکت ہوگی۔

یعنی چوہدری صاحب نے اب یہ فرمایا ہے کہ اگر پاکستان یہ فیصلہ کرلے کہ یہاں کا نظامِ حکومت خالص قرآنی ہوگا اور وہ اس نظام کو قائم بھی کرلے، تو بھی یہ حکومت، حکومتِ خداوندی یا قرآنی مملکت نہیں ہوگی۔ اسلامی نظامِ حکومت کے نفاذ کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی مختلف سلطنتیں، ایک مملکت بن جائیں۔ یہ مملکت ایک مرکزی حکومت کے تابع ہو اور اس میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ قرآن، تمام مسلمانوں کو ایک امت قرار دیتا ہے اس لئے ان سب کے لئے نظام بھی ایک ہی متعین کرتا ہے۔ ان کی مملکت بھی ایک ہی ہوگی اور ایک ہی مرکز۔ یہ ہے اسلام کا منتہیٰ اور یہ ہے قرآن کا مقصود۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں، جبکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں ہیں، اور پاکستان بھی ان میں سے ایک حکومت ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ چوہدری صاحب کا ارشاد ہے کہ پہلے ان تمام حکومتوں کے جداگانہ وجود کو مٹا کر ایک مملکت میں جذب کیا جائے اور پھر اس ایک مملکت میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ جب تک یہ نہ ہو جائے، کسی خطۂ ملک میں بھی قرآنی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ما چلے جیسی ہوئی۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی۔ روز روز کا جھگڑا ختم ہوا۔ اب کیجئے یہ مطالبہ پیش کہ پاکستان میں قرآنی حکومت ہونی چاہیئے۔ مطالبہ کرنے والوں سے کہدیا جائے گا کہ جائیے۔ پہلے مصر، شام، حجاز، ٹرکی، افغانستان، ایران، سمرقند، بخارا، جاوا، سماٹرا وغیرہ کے مسلمانوں سے کہئے کہ اپنی اپنی حکومتوں کو توڑ کر ایک مملکت بنائیں۔ جب یہ ہو جائے گا تو پھر قرآنی حکومت بھی قائم ہو جائیگی۔

پہلے تو چوہدری صاحب کے خود اپنے ان بیانات کو دیکھئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان میں نفاذ نظامِ شریعت کے متعلق کہیں یہ شرط نہیں تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی حکومتوں کو پہلے ایک حکومت میں تبدیل کرو پھر اسلامی نظام نافذ ہو سکے گا۔ ان میں پاکستان میں ایسی فضا پیدا کرنے کی شرط تھی جو اس نظام کے لئے سازگار ہو۔ یا اس نظام کو بتدریج رائج کرنے کی شرط۔

اب چوہدری صاحب کی عائد کردہ شرط کی طرف آیئے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، قرآنی نظام کی غایت یہی ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکزیت کے تابع ہوں لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو جائے کسی ایک خطۂ ارض میں اسلامی نظامِ حکومت رائج نہ کیا جائے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی موجودہ حالتِ جاہلیت سے اسلامی نظام کی طرف ابتدا ہی نہیں کر سکتے۔ فرض کیجئے آج تمام روئے زمین کے مسلمان اس پر متفق ہو جائیں کہ ہم ایک مرکزیت کے تابع آجاتے ہیں لیکن کسی ایک چھوٹے سے خطہ کی حکومت اس پر راضی نہ ہو تو چوہدری صاحب کے استدلال کے مطابق سب مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں کہ جب تک وہ ریاست راضی نہ ہو جائیگی اسلامی آئین کا نفاذ نہیں ہو سکے گا۔ یا مثلاً تمام حکومتیں ایسا نظام اپنے اوپر مسلط کرلیں لیکن اس کے بعد کسی ایک خطہ کے مسلمان اس سے الگ ہو جائیں، تو اس صورت میں باقی نظام بھی

غیر اسلامی ہو جائے گا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مسلمانوں کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ اس مرکزیت کے تابع آجائیں لیکن جب تک وہ اس مرکز کی اطاعت قبول نہ کریں اتنے عرصہ کے لئے تو اس مرکز کا نظام اسلامی نہیں رہے گا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں ایک قبیلہ نے زکوٰۃ کے مسئلہ میں مرکز سے سرکشی اختیار کر لی تھی تو جتنا عرصہ تک وہ قبیلہ مطیع نہیں کر لیا گیا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت اسلامی نظام کی حامل رہی تھی یا نہیں؟ چودہری صاحب کے استدلال کے مطابق تو وہ ایسی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے، تمام خطہ ارض کے مسلمانوں کی ایک مرکزیت سے وابستگی ضروری ہے۔ چوہدری صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس آیۂ کریمہ کو پیش کیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (اے ایمان والو۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت)۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ "یا ایھا الذین آمنوا" میں خطاب تمام ایمان والوں سے ہے اس لئے جب تک تمام مسلمان ایک مرکزیت پر جمع نہ ہو جائیں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں "یا ایھا الذین آمنوا" سے متعلق بیسیوں آیات ہیں۔ تو کیا ان تمام آیات میں یہی سمجھا جائے گا کہ جب تک ایک مسلمان بھی ایسا ہے جو اس حکم پر عمل نہیں کرتا، اس حکم کو ساقط العمل قرار دیا جائے گا۔ مثلاً مرکزیت ہی سے متعلق دوسری آیت میں جو "یا ایھا الذین آمنوا" سے شروع ہوتی ہے ارشاد ہے کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا" (اے ایمان والو، تم سب کے سب اللہ کے سررشتہ (قرآن) کو محکم پکڑ لو اور باہمی تفرقہ نہ کرو) اس وقت یہ ظاہر ہے کہ مسلمان فرقوں میں بٹ رہے ہیں۔ سو چوہدری صاحب کے استدلال کے موجب، جب تک تمام فرقے مٹ نہ جائیں کسی کو تمسک بالقرآن کی دعوت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی

(۱) فرقے مٹینگے، رجعت الی القرآن سے، اور

(۲) رجعت الی القرآن کی دعوت اسوقت دی جاسکے گی جب فرقے مٹ جائیں گے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے!

اس استدلال کو اور آگے بڑھائیے تو بڑے بڑے دلچسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ قرآن میں حکم ہے کہ یا ایھا الذین آمنوا (اے ایمان والو۔ جب جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو کاروبار چھوڑ کر ذکر اللہ کے لئے جمع ہو جایا کرو)۔ اب چوہدری صاحب کے استدلال کے مطابق جمعہ کی نماز ہو ہی نہیں سکتی جب تک تمام مسلمان نماز کی جگہ جمع نہ ہو جائیں۔ اگر ایک مسلمان بھی الگ رہ گیا تو باقی مسلمان بھی نماز نہیں پڑھ سکیں گے۔ یا مثلاً مسلمانوں کو جہاد کا حکم ہے۔ سو دعوتِ جہاد پر اگر ایک مسلمان بھی پیچھے رہ گیا تو جہاد شروع ہی نہیں ہو سکے گا۔ ہم حیران ہیں کہ اس استدلال کی بوالعجبی پر کہاں تک لکھتے جائیں۔ ہمیں چھوڑیئے۔ خود اسی طبقہ اکابرین نے جن میں سے چوہدری صاحب ایک ہیں سینکڑوں مرتبہ اس کا اعلان کیا ہے کہ "پاکستان اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنے گا جہاں سے اس شمع کی کرنیں پھوٹیں گی اور رفتہ رفتہ ساری دنیا کو محیط ہو جائیں گی اور اس طرح ہم دنیا کو دکھا دیں گے کہ یہ نظامِ فطرت

کس طرح انسانی نجات کا کفیل بنتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ اکابرین کا گروہ بھی ایک عجیب مخلوق ہے۔ جب ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بننے والا ہے تو چوہدری صاحب خاموش رہتے ہیں اور جب چوہدری صاحب فرماتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہو سکتا جب تک ساری دنیا کی حکومتیں ایک نہ بن جائیں، تو اول الذکر طبقہ خاموشی سے سنتا رہتا ہے۔ کوئی ایک دوسرے سے نہیں پوچھتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو! قوم کے ساتھ یہ عجیب مذاق ہو رہا ہے! یخٰدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر چوہدری صاحب کو اس قدر اضطراب کیوں ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

ہم کسی کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہتے۔ نیتوں کا جاننے والا وہی علام الغیوب ہے۔ لیکن قرائن و شواہد جس نتیجہ تک انسان کو پہنچاتے ہیں ان سے کچھ قیاس تو کیا جا سکتا ہے کہ فلاں امر کا جذبہ محرکہ کیا ہو سکتا ہے! یہ بھی ممکن ہے کہ انسان شعوری طور پر (Consciously) ایسا نہ کر رہا ہو لیکن بعض اوقات وہی محرکات غیر شعوری طور پر (un-Consciously) کشاں کشاں اسی مقصد کی طرف لئے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ چوہدری صاحب کے تمام مساعی کا حاصل، تمام امیدوں کا محور، مسلم لیگ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام میں سب سے پہلے جس ادارہ کا وجود ختم ہو گا وہ مسلم لیگ (یا اسی قسم کی اور پارٹیاں) ہو گی۔ اسلامی نظام میں ملت باقی رہتی ہے، پارٹیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قرآن تحزب و تشیع (گروہ سازیوں اور پارٹی بازیوں) کو شرک قرار دیتا ہے۔ مسلم لیگ، جمہوریت کے نام پر ایک بہت بڑا فریب ہے۔ خود چوہدری صاحب کے بیان کے مطابق مسلم لیگ کی رکنیت کی تعداد قریب چھبیس لاکھ (۲۵،۹۰،۷۹۲) ہے۔ یعنی قریب چھ کروڑ مسلمانوں میں سے ایک کروڑ کا قریب چوتھا حصہ لیگ کا ممبر ہے۔ اس لیگ کو چھ کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی حکومت اسی لیگ کی قائم کردہ ہو گی۔ اس لئے کہ چوہدری صاحب اور محترم لیاقت علی خاں صاحب نے فرما دیا ہے کہ یہاں "پارٹی گورنمنٹ" کے انداز کی حکومت ہو گی۔ یہ حکومت اس پارلیمنٹری بورڈ کی نامزد کردہ ہو گی جو چھبیس لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کریگا۔ (ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ لیگ کی جو کونسل مرتب ہوئی ہے اس کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا ہے۔ اور اب جو پارلیمنٹری بورڈ بنا ہے وہ کس حد تک منتخب ادارہ کہلا سکتا ہے۔ ان امور کی تفصیل سرحد اور پنجاب کے مبصرین سے پوچھئے۔ لیکن اس وقت ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ کونسل اور بورڈ فی الواقعہ نمائندہ جماعتیں ہیں) تو گویا پاکستان کی حکومت اس پارٹی کی حکومت ہو گی جو چھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چھبیس لاکھ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس قدر اقلیت کی حکومت، اتنی بڑی اکثریت کے سر تھوپ دی جائے گی اور اس کا نام رکھا جائے گا جمہوریت کی حکومت! اگر یہ جمہوریت کے نام سے فریب نہیں تو اور کیا ہے! یہی وہ مغرب کا انداز جمہوریت ہے جس کے متعلق ابلیس کے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

یہی وہ جمہوریت ہے جس پر اسلامی نظام کی سب سے پہلی زد پڑتی ہے۔ اور اسی جمہوریت کی علمبردار ہماری مسلم لیگ ہے۔ لہذا لیگ کا اسلامی نظام سے مخالف ہونا قابلِ فہم ہے۔ یاد رکھئے۔ اسلامی نظام سے مفہوم یہی نہیں کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیجئے یا زانی کو درے ماریئے۔ یہ تو تعزیری سزائیں ہیں جسے ہر نظام اپنے ہاں رائج کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام اس اوجِ انسانیت کا ترجمان ہے جس میں ملت کا ہر فرد اپنے آپ کو پوری کی پوری ملت محسوس کرتا ہے۔ وہ نظام جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہمارے ہاں چونکہ سنجیدہ فکر نایاب (نہیں تو کم از کم کمیاب) ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم چند مستعار اصطلاحوں کو لے لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے حقیقت کو پا لیا۔ مغرب نے اپنی ٹکسال میں لفظ جمہوریت ڈھالا اور ہم نے ساری دنیا میں اعلان کرنا شروع کر دیا کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"۔ ہر گوشے اور ہر کونے اور منبر اور ہر اسٹیج سے یہ اعلان ہو رہا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ جس جمہوریت کو میں عین اسلام قرار دے رہا ہوں اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس کے جذبات محرکہ کیا ہیں۔ اس کی بنیادیں کن میلانات و رجحانات پر قائم ہیں۔ وہ کن مقاصد کیلئے وجود میں لائی گئی ہیں۔ اس کی ملعونیت و مردودیت سے آج یہ دنیا کس قدر جہنم زار بن رہی ہے۔ جن کے ہاں اس جمہوریت کا دور دورہ ہے وہ خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالاں و گریاں ہیں۔ نہ کوئی دنیا کے احوال و عواطف کا مشاہدہ کرتا ہے نہ ان کے افکار و تخیلات کا مطالعہ۔ نہ کوئی حقائق کا اندازہ کرتا ہے نہ واقعات کا تجزیہ۔ بس ایک اندھی رَو ہے جس میں سب بہے جا رہے ہیں۔ اور ارباب ہوس و جاہ ان نظر فریب تصورات سے فائدہ اٹھا کر عوام کو اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور حصولِ حشمت و ثروت کے ان تمام مستبدانہ اسباب و وسائل پر خدا، رسول، قرآن، اسلام، جمہوریت، کے مقدس نقاب ڈال کر ہر قسم کے ہدفِ طعن و ملامت سے مامون ہو جاتے ہیں۔ یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا۔ فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۔

کہا یہ جاتا ہے کہ لیگ کے اخلاص اور بے غرضی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس میں شرط یہ عائد کر دی گئی ہے کہ کارکنانِ لیگ، حکومت کے مناصب و مدارج کے لئے امیدوار نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ "بادشاہ گری" میں جو لذت ہے وہ خود بادشاہت میں نہیں۔ "پارٹی سسٹم" کی حکومت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ اور جب پارٹی بھی ایک ہی ہو تو اس کی ڈکٹیٹر شپ کا کون حریف ہو سکتا ہے۔ چونکہ زمانہ قبل از تقسیم

ہیں، لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قرار پاگئی تھی، اس لئے اب بھی ذہنوں پر یہی مستولی ہے کہ لیگ کا مخالف مسلمانوں کا مخالف اور قوم کا غدار ہے۔ چنانچہ خود چوہدری صاحب نے اپنی رپورٹ میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ

> یہ حقیقت کہ لیگ کے مقابلہ میں پاکستان میں کوئی اور سیاسی جماعت موجود نہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہی مسلم لیگ ہے۔

اور اس کے بعد لیگ کی خدمات اور اسلاف کے کارناموں کے تذکرہ سے جذبات کو یوں اپیل کیا گیا کہ

> مسلمانوں کے لئے لیگ کی خدمات بے حد و شمار ہیں اس لئے اسے زندہ اور مضبوط رکھنے کا فریضہ ہم سب پر عائد ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جس طرح پاکستان کا تحفظ ہمارا فرض ہے اسی طرح لیگ کو زندہ اور پائندہ رکھنا بھی ہر مسلمان کا فرض ہے تاکہ اس طرح ہم اس شمع کو روشن رکھ سکیں جسے ہمارے قائداعظم نے قوم کی راہنمائی کے لئے جلایا تھا۔

آپ نے دیکھا ہے کہ لیگ کو کس طرح واجب الاحترام اور "قابل پرستش" بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب مغربی سیاست کی قدم بقدم تقلید ہے۔ وہ لوگ "قوم" یا "وطن" کو ایک بت بنا دیتے ہیں اور پھر عوام سے اس کی پرستش کراتے ہیں اور اس سے مقصد اپنی پارٹی کا تحفظ اور پائندگی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں لیگ کا بت بنایا جا رہا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ "لیگ نے مسلمانوں کی بے حد و شمار خدمات سرانجام دی ہیں" اس لئے لیگ کا تحفظ اور استحکام ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس سے ذہنوں میں کچھ ایسا تصور آتا ہے کہ لیگ بھی ایک مستقل وجود رکھنے والا فرد ہے جس نے مسلمانوں کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں اس لئے اس کا احترام نہایت ضروری ہے۔ حالانکہ آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ لیگ کسی مستقل ہستی کا نام نہیں۔ افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ افراد جنہوں نے مسلمانوں کے خدمات سرانجام دی تھیں واجب الاحترام تھے (اور اب بھی ہیں)۔ لیکن یہ لیگ کیا بلا ہے جس کا تحفظ اور استحکام ہر مسلمان پر فرض قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ لیگ اس پارٹی کا نام ہے جو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس پارٹی (یعنی چند افراد) کا تحفظ اور استحکام ملت کا فریضہ بتایا جاتا ہے۔ تحفظ اور استحکام ملت کا ضروری ہے نہ کہ ملت کی کسی پارٹی کا۔ یاد رکھئے۔ قرآن نے جب فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا تو اس سے مقصود مذہبی فرقے ہی نہیں تھے۔ سیاسی پارٹیاں بھی تھیں۔ اسلام کے نزدیک پوری کی پوری ملت ایک جماعت ہے۔ ملت کے اندر پارٹیوں کا وجود یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔ یہ خالص مغربی سیاست کا تتبع ہے (اور وہ بھی بہت بھونڈی شکل میں) اور ہوس اقتدار کی تسکین کا سامان۔ لیگ کی تجدید سے ملک میں پارٹی بازی کی لعنت کا جو بیج بو دیا گیا ہے اس کا نتیجہ وہ تشتت و انتشار ہوگا جو ملک کو جہنم بنا دے گا۔ اب دوسری پارٹیاں بھی کروٹ لیں گی۔ اگر لیگ کی حکومت ان پارٹیوں کے برسر اقتدار آنے میں مانع ہوگی (اور یہ بالکل بدیہی ہے کہ وہ مانع ہوگی) تو قوم کے مختلف ٹکڑوں میں باہمی تصادم ہوگا اور اگر بفرض محال مانع نہ ہوئی تو بھی قوم، مختلف پارٹیوں کی باہمی جدل و مقابلہ کا اکھاڑہ بنی رہے گی۔ غور کیجئے چند افراد کی ہوس اقتدار کس طرح پوری کی پوری قوم کو جہنم کے گڑھے کی طرف لیجا رہی ہے۔

الم تر الی الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا واحلوا قومھم دار البوار۔ جھنم یصلونھا وبئس القرار

---

۱۹ اور ۲۰ فروری کو مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت کے سب سے بڑے شہر میں مسلمانانِ عالم کا سب سے بڑا اجتماع ہوا جس کا نام تھا موتمر عالم اسلامی۔ جہاں تک اس اجتماع عظیم سے متعلق انتظامات اور اجلاس کی "کامیابی" کا تعلق تھا، موتمر کے منتظمین فی الواقعہ مستحقِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اتنی بڑی کانفرنس کے انعقاد کا عزم کیا اور پھر اسے اس طرح پورا کر دکھایا۔ ان کا کام عالم اسلامی کے مشاہیر و زعما کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا تھا۔ سو انہوں نے یہ کر دیا۔ اس اجتماع کو کیا کرنا چاہئے تھا اور انہوں نے کیا کیا، یہ منتظمین کا کام نہ تھا۔ اس موتمر کے انعقاد کا چرچا کافی عرصہ سے ہو رہا تھا اس لئے پاکستان (اور غالباً ہندوستان) کے مسلمان مضطربانہ منتظر تھے کہ وہ دیکھیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے قلوب و اذہان یک جا جمع ہو کر ملت کے ان مصائب و نوائب کے لئے کیا تجویز کرتے ہیں جو آج امت مسلمہ کو عالمگیرانہ حیثیت سے چاروں طرف گھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک نمائندگی کا تعلق تھا، یہ اجتماع فی الواقعہ ممالکِ اسلامیہ کا نمائندہ اجتماع کہلا سکتا ہے۔ مراکش، مصر، شام، عراق، فلسطین، حجاز، افغانستان (غالباً ایران کا نمائندہ نہیں تھا) انڈونیشیا، حتیٰ کہ سیلون تک کے مسلمانوں کے نامور مندوبین شریک اجتماع ہوئے۔ ادھر پاکستان کے ہر صوبے کے علما و زعما بھی شریک مجلس تھے۔ اب اس سے بڑھ کر مسلمانانِ عالم کے دل و دماغ کی یکجہتی کی تصویر اور کونسی ہو سکتی تھی! لیکن ان نمائندگانِ عالم اسلام نے جمع ہو کر کیا سوچا اور کیا بتایا؟ اس کا اندازہ آپ نے موتمر کی روئداد سے لگایا ہو گا جو اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہے۔ انہوں نے، جیسا کہ ہر کانفرنس میں ہوتا ہے، فلسطین، کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ وغیرہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کئے اور نہایت "ولولہ انگیز اور فلک بوس" تقاریر کے ہجوم میں انہیں پاس کرایا۔ (عربی زبان خطابت کے لئے تو خاص طور پر موزوں ہے اس لئے ان تقاریر میں، جو بالعموم عربی زبان ہی میں ہوئیں، خطابت کا زور خاص طور پر نمایاں تھا) یہ ریزولیوشن پاس کئے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے آنے والے نمائندگان واپس تشریف لے گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام تگ و تاز اور سعی و عمل محض ان قراردادوں کے پاس کرنے کے لئے تھی؟ یہ قراردادیں تو ان ہنگامی حوادث سے متعلق ہیں جو اس وقت سامنے آ گئے ہیں۔ لیکن اصل سوال تو ان سے کہیں گہرا ہے۔ یہ تو بعض علاماتِ مرض ہیں، علتِ مرض کچھ اور ہے۔ علامات پر غور و فکر کرنے اور ان کا علاج سوچنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اصل کام تو علتِ مرض کی تشخیص اور اس کا صحیح علاج ہے۔ ہم توقع باندھے بیٹھے تھے کہ یہ حضرات، جو اس وقت تمام ملتِ اسلامیہ کے دل و دماغ کا منتخب مجموعہ ہیں، اس علتِ مرض کے متعلق سوچیں گے اور اس کے علاج کی تدبیر بتائیں گے۔ ملت کے سامنے آج اصل سوال وہ ہے جو ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت حاضرہ میں کسی دوسری جگہ "سوال" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس سوال پر کسی نے غور نہیں کیا۔ اگر کسی نے کچھ کہا بھی تو صرف اس قدر کہ ہم ذلیل اور کمزور اس لئے ہیں کہ ہم میں اتحاد نہیں۔ ہم میں اخوت نہیں۔ ہم میں مساوات نہیں۔

ہم میں کیریکٹر نہیں، لیکن یہ تو اسی سوال کو دہرا دینا ہے۔ سوال کا جواب تو نہیں۔ سوال تو ہے ہی یہی کہ ہم میں اتحاد کیوں نہیں۔ اخوت کیوں نہیں۔ مساوات کیوں نہیں۔ کیریکٹر کیوں نہیں۔ وہ کونسا مرض ہے جس کی یہ علامات ہیں اور اس کا علاج کیا ہے؟ علاج کے متعلق حکومتِ سعودیہ کے سفیر پاکستان، محترم سید عبدالحمید الخطیب نے فرمایا کہ

> "اس وقت ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص خدا سے اس بات کا عہد کرے کہ وہ اس کی دعوت دیگا اور اپنے گردوپیش اور حلقۂ اثر میں لوگوں کے عقائد درست کرے گا۔ اس مقصد کے لئے جماعتیں قائم ہونی چاہئیں جو تمام عام اور خاص جلسوں میں، مسجدوں میں اور شہروں اور دیہاتوں میں اس دعوت کو پھیلانے کی کوشش کریں۔"

اس علاج پر آپ خود ہی غور فرمائیے۔ ہمارا تبصرہ بیکار ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آجکل مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں میں باہمی اتحاد کے لئے ایک خاص جذب و شوق نظر آرہا ہے لیکن اگر جذبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ اس اتحاد کا جذبۂ محرکہ وہ ہنگامی حوادث ہیں جو اس وقت مختلف ممالکِ اسلامیہ میں وجہ مصائب بن رہے ہیں۔ چنانچہ اس ولولۂ اتحاد میں وہ ممالک سب سے آگے ہیں جو ان حوادث سے براہِ راست متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ اتحاد اسی قسم کا ہے جس قسم کا اتحاد گذشتہ دو عالمگیر لڑائیوں میں یورپ کے دول متحدہ میں ہوا تھا۔ ان کے سامنے ایک مشترکہ حملہ تھا جس کے دفعیہ کے لئے انھوں نے باہمی اتحاد ضروری سمجھا تھا۔ یہ اتحاد محض سیاسی مصالح کی خاطر تھا۔ دلوں کا اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ جب وہ سیاسی مقاصد حاصل ہو گئے تو اتحاد کے یہ اجزاء پھر منتشر ہو گئے اور اب ان میں ایک تیسری جنگ کے لئے رسہ کشی ہو رہی ہے۔ اسی قسم کا اتحاد ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں کے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ اس اتحاد کے لئے دلائل بھی دیئے جاتے ہیں کہ دیکھ لیجئے ہمارے تشتت و انتشار سے ہم پر فلسطین میں کیا گذری، کشمیر میں کیا ہوا، حیدرآباد کس قیامت کا شکار ہو گیا۔ انڈونیشیا میں اب کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ ریزولیشن جو مؤتمر اسلامی (کراچی) میں پاس ہوئے وہ خود ان دلائل کے آئینہ بردار ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد سے ان کے سیاسی مصالح ضرور حاصل ہوں گے اور ان کی مملکتیں غیروں کے دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گی، لیکن یہ تو اُس اتحاد کا محض ضمنی حاصل (By Product) ہوگا جو قرآن ملتِ اسلامیہ کے افراد میں ائتلاف پیدا کرنا چاہتا ہے جو قلوب کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اس کے لئے کوئی ہنگامی حوادث محرک نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کے ایمان کا تقاضا، بلکہ اس کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ ہو رہا ہے کہ قرآن کو محض ثواب کے لئے رکھ چھوڑا ہے اور سیاسی مقاصد کے لئے باہمی اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کوششوں میں الفاظ وہی استعمال ہو رہے ہیں جو قرآن نے دیئے ہیں۔ اخوت، مساوات، ایمان، تقویٰ، ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک قبلہ۔ وقس علیٰ ذالک ۔۔۔ لیکن یہ ایسے ہی تھے جیسے یورپ

کی دولِ متحدہ باہمی اتحاد کے لئے جمہوریت، انسانیت، حریت وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتی تھیں (اور اب بھی کر رہی ہیں)۔ ہمارے ہاں عملاً حالت یہ ہے کہ مختلف ممالک اسلامیہ میں وطنی حدود کی بنا پر قومیتیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر قوم کے اپنے اپنے مقاصد اور اپنے اپنے مصالح ہیں۔ قیامت بر قیامت کہ ان میں بادشاہتیں تک قائم ہیں۔ لیکن ان اقوام کے نمائندوں کی زبان پر اخوت، مساوات، جمہوریت، وحدتِ ملت کے الفاظ بلا تکان چلے آتے ہیں۔ قرآن کا تجویز کردہ ائتلاف (الف بین قلوبکم) اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے، کہ تمام مسلمانوں کا نصب العین زندگی قرآن ہو۔ لیکن قرآن چونکہ ملوکیت اور برہمنیت کی جڑ کاٹتا ہے اس لئے یہ لوگ قرآن کے قریب کس طرح آسکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ موتمر عالمِ اسلامی کے اس اجتماعِ عظیم میں کسی نے قرآن کی طرف آنے کی دعوت نہیں دی (شام کے نمائندہ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی امامت پاکستان کے مسلمانوں کی منتظر ہے اور وہ امامت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ یہاں کے مسلمان شریعت کو اپنا آئین بنائیں۔ لیکن اس سے بھی ان کی مراد ویسا ہی آئینِ شریعت تھا جیسا دیگر ممالکِ اسلامیہ میں رائج ہے۔ چنانچہ انہوں نے سلطان ابنِ سعود کی حکومت کو شرعی نظام کا بہترین نمونہ قرار دیا تھا۔ اسی ابنِ سعود کی حکومت کو جو خود بادشاہ ہے اور جس کے دارالسلطنت میں غلام اور کنیزیں سرِ بازار فروخت ہوتی ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے خدا، رسول، قرآن، کو اپنے سیاسی مصالح کے لئے اسی طرح سپر بنا رکھا ہے جس طرح یورپ کی قوموں نے جمہوریت اور آزادی کے الفاظ کو اپنی دسیسہ کاریوں اور کاموبیوں کے لئے نقاب بنا رکھا ہے۔ ہم اس طرح خدا اور اس کے دین کے ساتھ علانیہ مذاق کر رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کے متعلق خود خدا نے فرمادیا ہے کہ واللہ یستھزئ بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون۔ ہمارے اقوال اور اعمال میں کس قدر بُعد و تباین ہے اور ہم حقائق کا مقابلہ کرنے سے کس قدر گھبراتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جس کا ذکر محترم پرویز صاحب نے اپنے ایک شذرہ میں کیا ہے جو طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اس شذرہ کو غور سے پڑھئے اور سوچئے کہ ہماری حالت کیا ہو چکی ہے۔ ہم منبروں اور اسٹیجوں سے اعلان پر اعلان کرتے ہیں کہ اسلام میں دین اور دنیا میں کوئی تفریق نہیں۔ اور جب ان حضرات سے کہا جاتا ہے کہ ان کا عملی فیصلہ ان اعلانات کے خلاف جا رہا ہے تو یہ کہہ کر معاملہ کو ٹال دیا جاتا ہے کہ ایسے (بیکار) مباحث پر وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے۔ کہئے کہ یہ تلاعب بالدین نہیں تو اور کیا ہے؟ جب خدا اور قرآن کا نام ہمارے مفاد کے مطابق ہوتا ہے یعنی جب ان کا حوالہ ہمیں ([illegible]) کرتا ہے۔ تو ہم انہیں سامنے لے آتے ہیں اور جب یہ چیزیں ہمارے مفاد کے خلاف جاتی ہیں تو ان پر گفتگو کرنا بھی تضیعِ اوقات سمجھا جاتا ہے۔ کہئے کہ اس طرزِ زندگی کا نتیجہ کبھی فلاح و بہبود بھی ہو سکتا ہے؟ ہمیں سب سے زیادہ رنج اس امر سے ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نظامِ کہن کی ان شقوں کو جن سے کبھی ایک دنیا لرزہ براندام تھی اپنے عمل سے رفتہ رفتہ اس درجہ

پامال کر دیا ہے کہ وہ اب دنیا کے لئے ہنسی کا موجب بن چکی ہے۔ خلافت کا تصور کہ جس لفظ سے کبھی انسانیت کا بلند ترین مقام ذہنوں میں آتا تھا، اس بری طرح رسوا ہوا کہ اب اگر کبھی اس ادارہ کا احیاء بھی ہوا تو شاید اس کے لئے کوئی اور اصطلاح وضع کرنی پڑے۔ ہجرت کہ جو ہر طاغوتی قوت سے قطع علائق کا کھلا ہوا چیلنج تھا، بیس پچیس برس اُدھر کی ایک ہنگامی تحریک میں بازیچۂ اطفال بن گیا۔ جہاد کہ جس کا ذکر دنیا کے ہر باطل نظام کو ہلا دینے کے لئے کافی تھا، اب ایک فرسودہ مضمون بن کر رہ گیا ہے جس میں زندگی اور حرارت کی کوئی رمق محسوس نہیں ہونے پاتی۔ اب "اخوتِ اسلامی" کی باری ہے۔ یہ وہ اصطلاح تھی جو ابھی کل تک یورپین اقوام کے لئے ہیبت اور رعب کا موجب بن رہی تھی۔ اب اس قسم کی موتمروں سے اس کا بھی بھرم کھل جائے گا۔ خدا کے لئے کوئی تو سوچو کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟

یہاں پہنچکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام عالمِ اسلام میں آج ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ان حقیقتوں پر غور کرے اور زندگی کے ان مسائل کو زندہ انسانوں کی طرح سلجھانے کے لئے اٹھے اور ملت کے مصائب کا حل قرآن کی روشنی میں سوچے!

یہ سوال بڑا حوصلہ فرسا اور ہمت شکن ہے! اس کے جواب کے تصور سے روح کانپتی ہے!

مؤتمر عالم اسلامی

(ایک واقعہ)

(از۔ پرویز صاحب)

۱۹ر فروری کو مؤتمر عالم اسلامی کی سبجکٹس کمیٹی کے اجلاس میں اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ اس میں پہلے مؤتمر کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں بتایا گیا کہ یہ مؤتمر کسی ہنگامی تقریب یا وقتی اجتماع کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مستقل ادارہ ہے جو تمام ممالک اسلامیہ کے نمائندگان پر مشتمل ہے۔ اس کے سالانہ اجلاس مختلف ممالک میں ہوا کریں گے۔ چنانچہ اس کا نام ہی "دائمی مؤتمر عالم اسلامی" قرار پایا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ملت کے اجتماعی امور کا حل (جسے احیاء اسلام کے جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا تھا) تمام دنیا کے مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے تلاش کیا جائے اور ایسے اسباب و وسائل اختیار کئے جائیں جن سے یہ مقصد عالیہ سہل الحصول ہو جائے۔ اسی سلسلہ میں تعلیم کا ذکر چھڑ گیا اور اس میں بحث اس موضوع پر آگئی کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم جس میں دینی تعلیم الگ مدارس میں دی جاتی ہے اور دنیاوی تعلیم جداگانہ سکولوں میں یکسر غیر اسلامی ہے کیونکہ اس سے دین و دنیا دو الگ الگ شعبے قرار پا جاتے ہیں حالانکہ اسلام میں، مذہب و سیاست، دنیا و آخرت، روح اور مادہ، میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ چنانچہ فلسطین اور شام کے محترم مندوبین نے بیک آواز کہا کہ اس قسم کی تفریق اسلام سے بدترین عداوت ہے۔ میں خوش تھا کہ مقام شکر ہے کہ ہمارے زعمائے کرام کی زبان سے یہ الفاظ سننے میں آرہے ہیں۔

اس مقام پر میں نے صدر صاحب کی اجازت سے ایک گذارش کی جرأت کی۔ میں نے کہا کہ اس موقعہ پر میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے جسے میں ایک قرآن کے طالب علم کی حیثیت سے آپ حضرات کے سامنے پیش کر کے اس کے ازالہ کی درخواست کرتا ہوں۔ آپ حضرات نے ابھی ابھی متفقہ طور پر یہ فرمایا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں امتیاز کرنا، اسلام سے بدترین عداوت ہے۔ اگر آپ حضرات یہ نہ بھی فرماتے تو بھی اس باب میں ہمارا عقیدہ بالکل ظاہر ہے۔ ہم ساری دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ایک مسلمہ کی حیثیت سے پیش کرتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست اور دین اور دنیا میں کوئی امتیاز نہیں۔ ہمارے سیاسی دعاوی اسی مسلمہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہم حقائق اسلام کو دنیا کے سامنے اسی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے دلائل میں

ہم اکثر و بیشتر یہ حقیقت بھی پیش کرتے ہیں کہ ہماری نماز کو دیکھئے۔ یہ پنجوقتہ اجتماع صرف عبادت ہی نہیں بلکہ ہمارا محلہ وار معاشرتی اجتماع بھی ہے۔ یہی دائرہ وسیع ہو کر سارے شہر کو محیط ہو جاتا ہے تو جمعہ کی نماز بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اور پھیلتا ہے تو عیدین کی نماز کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اس کے بعد حج کا اجتماع آتا ہے جو درحقیقت مسلمانانِ عالم کی سالانہ کانفرنس ہوتی ہے۔ جس میں عبادت کے ساتھ ساتھ ہمارے تمام بین الملی اجتماعی مسائل کا حل سوچا جاتا ہے۔ ان دلائل کو ہم اپنوں اور بیگانوں، سب کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر اپنوں سے گلہ کرتے ہیں کہ ہم نے حج کی رسم کو تو قائم کر رکھا ہے لیکن اس کی روح بھلا دی ہے۔ ہماری حیاتِ نَو کا راز اسی میں ہے کہ ہم ان شعائر میں ان کی اصل روح پیدا کر دیں۔ وقِس علیٰ ذالک۔"

یہاں تک تمام حضرات کے تمتماتے ہوئے چہرے، متبسم لب اور سروں کی جنبش اس حقیقت کے آئینہ دار تھی کہ وہ مجھ سے متفق ہیں، بلکہ خوش۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ "ایک طرف حج کا وہ اجتماع ہے جسے ہم "مستقل مؤتمر عالم اسلامی" کہتے ہیں اور جس میں دنیائے اسلام کے تمام نمائندے جمع ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ہم ایک اور "مستقل مؤتمر عالم اسلامی" قائم کرتے ہیں جو دنیائے اسلام ہی کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اس مؤتمر کی بنیادی غرض "احیائے اسلام" یعنی ملت کے اجتماعی مسائل کا حل قرار دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملت کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ہمیں اس مؤتمر کے قیام و دوام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو پھر حج کے مؤتمر سے کیا مقصود ہے؟ کیا ہم اس مستقل مؤتمر کے قیام سے خود ہی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کر رہے کہ حج کا اجتماع "دین" ہے اور دنیاوی مسائل کے حل کے لئے ہمیں ایک اور مؤتمر کی ضرورت ہے! اور کیا یہ اعتراف خود ہمارے ان دعاوی کی کھلی ہوئی تردید نہیں جن کی رو سے ہم دین اور دنیا کے امتیاز کو اسلام سے بدترین عداوت قرار دیتے ہیں۔ میں دریافت یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ان دعاوی اور اس عمل میں تطبیق و توفیق کی کیا صورت ہے؟ اگر حج کا اجتماع محض "مذہبی" فریضہ ہے اور اس سے مقصود ہمارے بین الملی مسائل پر غور و فکر نہیں، تو ہمیں اس امر کا اعلان کر دینا چاہیئے اور آئندہ کبھی یہ دعوےٰ نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے دنیاوی مسائل پر غور و تدبر کے لئے بھی ہمارے دینی اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج حج ایک مذہبی رسم بن کر رہ گیا ہے اس لئے اس سے یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ ہم حج کو از سرِ نو قرآنی خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کریں نہ کہ اُسے ایک مذہبی رسم رہنے دیں، اور دنیاوی مسائل کے حل کے لئے الگ مؤتمریں قائم کرتے پھریں۔ ہمارا یہ طرزِ عمل دین اور دنیا کی اس ثنویت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیگا جسے ہم بلند آہنگی سے خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں؟"

یہ تھا میرا سوال۔

میرے سوال پر محفل کا رنگ کچھ بدل سا گیا اور اہل مجلس کے چہروں پر کچھ اضطراب و تردد کے آثار نمایاں ہونے لگے جس سے مجھے صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں میرا سوال ناگوار گذرا ہے یا وہ اسے کم از کم

بے وقت کی راگنی" تصور کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف حالت یہ تھی کہ وہ ہزاروں میل کی مسافتیں طے اور سفر کی صعوبات برداشت کرکے مؤتمر میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے منتظمین حضرات نے اس اجتماع غیر کے انتظامات کے سلسلہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس باب میں ان کی ہمت قابلِ داد تھی)۔ وہ اس مؤتمر کو ایک مستقل ادارہ کی شکل دے رہے تھے (اس کا انھوں نے فیصلہ بھی کر دیا تھا) دوسری طرف انھوں نے ابھی ابھی متفقہ طور پر فرمایا تھا کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق یکسر غیر اسلامی ہے۔ اندریں حالات میرے سوال نے غالباً انھیں ضغطہ میں ڈال دیا۔ لیکن میں طالب العلمانہ حیثیت سے بدل متمنی تھا کہ عالم اسلام کے ان مفکرین کے اجتماع سے میری اس خلش کا مداوا ہو سکے۔ اب جوابات شروع ہوئے۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ حج میں انسان اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے جاتا ہے اور جوشِ روحانیت میں اُسے اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان دنیاوی مسائل کی طرف توجہ دے سکے۔

(یہ جواب اسی مجمع کی طرف سے آرہا تھا جو ابھی ابھی دین اور دنیا اور مادہ اور روحانیت کے امتیاز کو اسلام سے بدترین عداوت قرار دے چکے تھے)

دوسرے صاحب نے فرمایا کہ ہاں! حج بھی ایک مؤتمر ہے۔ لیکن اس سے یہ تھوڑا لازم آتا ہے کہ ہم اس کے علاوہ اور مؤتمریں قائم ہی نہیں کر سکتے۔

(یعنی تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک وہ مؤتمر ہے جو میدانِ عرفات میں منعقد ہوتی ہے اور جس کا مقصد ملت کے اجتماعی مسائل کا حل قانونِ خداوندی کی روشنی میں تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کے عوض انہی نمائندگان کی ایک اور مؤتمر جو بالکل اسی مقصد کے حصول کے لئے قائم کی جارہی ہے! بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!)

تیسرے صاحب نے فرمایا کہ سلطان ابن سعود اس کی کب اجازت دے سکتے ہیں کہ حج کو اس قسم کا "سیاسی اجتماع" بنا دیا جائے!

(واضح رہے کہ اس مؤتمر میں سلطان ابن سعود صاحب کی طرف سے ایک چھوڑ دو دو نمائندے تشریف لائے تھے اور ان میں سے ایک صاحب خود اس وقت جلسہ میں موجود تھے۔ پھر انہی میں وہ حضرات بھی موجود تھے جو گذشتہ شب سلطان ابن سعود کی حکومت کو اسلامی حکومت کا بہترین نمونہ قرار دے چکے تھے۔)

ایک اور بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ حج سال میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے۔ اگر ہمیں سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ اجتماع کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ہم کیا کریں۔

(یعنی یہ اس امر کا اعتراف تھا کہ (ان بزرگ کے نزدیک) قرآنی نظامِ اجتماع ہماری ضروریاتِ ملی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمیں اور طریقے بھی ڈھونڈھنے پڑیں گے۔ وہ بھول گئے کہ قرآن نے حج کے علاوہ عمرہ بھی تجویز کر رکھا ہے۔)

ایک جلیل القدر ہستی نے ارشاد فرمایا کہ حج عمر میں ایک ہی مرتبہ ضروری ہے لیکن کانفرنسوں میں بار بار شریک ہوا جا سکتا ہے۔

(انھوں نے یہ نہ بتایا کہ ایک سے زیادہ مرتبہ حج کی ممانعت کہاں آئی ہے۔ اور یہ بھی کیا ضرور ہے کہ ایک ہی نمائندہ بار بار حج کے مؤتمر میں شرکت کے لئے بھیجا جائے۔)

ایک صاحب نے فرمایا کہ جس عقل و فکر کے لوگ بالعموم حج کرنے جاتے ہیں ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ملت کے اجتماعی مسائل کا حل سوچ سکیں گے، خود فریبی ہے۔

(اس جواب پر خود اہل محفل ہنس پڑے تھے)

یہ تھے وہ جوابات جو عالم اسلام کے ایسے جلیل القدر مفکرین کے اجتماع کی طرف سے مجھے ملے میں چاہتا تھا کہ ان جوابات سے متعلق ان کی خدمت عالیہ میں کچھ عرض کرنے کی اجازت مانگوں کہ انھوں نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ جوابات تسلی بخش ہیں اس لئے اس سوال پر مزید بحث میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے! چنانچہ انھوں نے اس معاملہ کو یوں ختم کر دیا گیا۔ اور اس "رسم" کے پورا کرنے کی بھی ضرورت نہ محسوس کی کہ جس شخص نے سوال کیا تھا کم از کم اس سے پوچھ تو لیا جائے کہ وہ مطمئن ہو گیا ہے یا نہیں۔

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے میرا مقصود نہ تو اس مؤتمر پر کسی قسم کی تنقید ہے اور نہ ہی کسی شخص کی تکفیر و تنقیص مقصود صرف یہ ہے کہ وہ لوگ جو ملت کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے عالم اسلام کے ان ارباب فکر و تدبر کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان حضرات کا یہ اجتماع عوام کو بتائے گا کہ موجودہ حالات میں قرآن ہمارے لئے کیا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے، انھیں معلوم ہو جائے کہ ان زعمائے کرام کا اسلوب فکر کیا ہے اور ان سے کس حد تک توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ملت کے مصائب و آلام کا مداوا قرآن کریم سے تجویز کر سکیں گے۔ یہ اجتماع کوئی معمولی اجتماع نہیں تھا۔ یہ اجتماع تھا تمام ممالک اسلامیہ کے مشاہیر عظام کا۔ سو

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

میں عام طور پر آجکل کے اجتماعات میں شریک نہیں ہوا کرتا (حالانکہ بہت سے احباب مجھ سے اس بنا پر گلہ مند بھی ہیں) لیکن ان حضرات کی تشریف آوری کا میں ہمہ تن شوق انتظار کر رہا تھا۔ میرے جی میں تھا کہ ان سے ان مہمات امور میں استفادہ کرونگا جو آج ہر قلب حساس کو طلسم پیچ و تاب بنائے ہوئے ہیں اور جن کے حل میں نہ صرف ملت اسلامیہ، بلکہ نوع انسانی کی نجات کا راز مضمر ہے۔ لیکن اس ایک واقعہ نے میری توقعات پر اوس سی ڈال دی۔ اس لئے یہ واقعہ در اصل اس حقیقت کی پردہ دری کر رہا تھا کہ ——— نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری

کہ خودی کی بیداری ہوتی ہے تمسک بالقرآن سے اور قرآن آج نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

لیکن وہ نقش دگر کب مرتب ہوگا اور کہاں سے ابھرے گا ــ مسکین و لکم ماندہ درین کشمکش اندر!

(طلوع اسلام ــ لمعات ملاحظہ فرمایئے)

یومِ اقبالؒ

گزشتہ سال، حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے یومِ وفات کی تقریب پر مرکزی حکومت کے دفاتر میں تعطیل کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام اور دفتر شعبۂ امورِ داخلہ (مرکزی حکومت، کراچی) میں جو خط و کتابت ہوئی تھی، وہ اپنی دلچسپی اور عبرت آموزی کے لئے اب تک قارئین کے ذہن میں ہوگی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ حکومت کی طرف سے شائع کردہ فہرست تعطیلات میں گرو گوبند سنگھ اور گرو نانک تک کے یوم پیدائش وغیرہ کی چھٹیاں تو موجود تھیں لیکن نہیں موجود تھی تو اس حکیم الامت کے یوم وفات کی تعطیل جس نے مسلمانوں کو پاکستان کا تصور دیا اور جس کی فکر نے انھیں زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ طلوعِ اسلام نے اربابِ حکومت کی توجہ اس سہو کی طرف مبذول کرائی تو فطرتِ حاکمیہ جوش میں آگئی اور جواب مل گیا کہ اس سال وقت بہت کم ہے، آئندہ سال دیکھا جائیگا۔ پھر عرض کیا گیا کہ سرکار! حضور کے فیصلوں کی برق رفتاریاں تو ایسی بھی ہیں کہ گاندھی کے قتل کی خبر ملنے کے تین گھنٹے بعد تعطیل کا اعلان ہو گیا تھا اور یومِ اقبالؒ میں تو ہنوز کافی وقت باقی ہے۔ قصہ مختصر، ۲۰ اپریل کی شام کو ۲۱ اپریل (یوم وفات علامہ اقبالؒ) کی تعطیل کا اعلان ہوا اور لوگوں نے سعدی کے اس شعر کا صحیح مطلب سمجھ لیا کہ

آنچہ دانا کند، کند ناداں　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ہم مطمئن ہو گئے کہ خیر! بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی، آئندہ کے لئے راستہ تو صاف ہو گیا۔

لیکن وہ حاکم ہی کیا ہوا جو ایک مرتبہ کی درخواست پر مستقل طور پر معاملہ صاف کر دے۔ چنانچہ اس سال کی فہرست تعطیلات میں پھر یوم اقبال کی تعطیل غائب ہے۔ ابھی اس تقریب میں ایک ماہ اور اکیس دن باقی ہیں۔ ہم اربابِ حکومت کی توجہ پھر اس سہو کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کرتے ہیں اور بادب گزارش کرتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ سے بھی دیکھ لیا ہے کہ اقبال کا یوم وفات ہر سال آتا ہے، تو اس کی تعطیل کے لئے مستقل فیصلہ صادر فرما دینے میں کونسا امر مانع ہے!

رفتارِ عالم

ہمارا ارادہ تھا کہ جنوری کی اشاعت سے عنوان بالا کے تحت مہینہ بھر کی خبروں پر تبصرہ شروع کریں، لیکن شوق کے تنگیٔ جا کے دیرینہ گلہ نے اسے شرمندۂ عمل نہ ہونے دیا۔ اس اشاعت سے اس مستقل عنوان کا آغاز کر دیا گیا ہے اور جنوری کے چیدہ چیدہ واقعات کو بھی تسلسل قائم رکھنے کیلئے منضبط کر دیا گیا ہے۔ آئندہ صرف متعلقہ مہینوں کے کوائف پر ہی تبصرہ کیا جائیگا۔ — تحریر

کشمیر میں التوائے جنگ

سال نو ۱۹۴۹ء کا آغاز اس جانفزا خبر سے ہوا کہ ریاست جموں و کشمیر میں ہندوستان و پاکستان نے متفقہ طور پر لڑائی بند کر دی ہے۔ سابقہ اشاعت میں اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں چند غیر ذمہ دار تقریروں کے علاوہ توجیہات و تاویلات سے خلط مبحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہاں کے اخبارات نے مستند اور مصدقہ رنگ میں اس قسم کی خبریں دینا شروع کیں کہ پاکستان نے ریاست کی تقسیم پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اور رائے شماری ضلع وار یا علاقہ وار ہوگی۔

توجیہات و تاویلات کے اختلاف کے باوجود فریقین نے التوائے جنگ کے حکم پر سختی سے عمل کیا ہے اور ابھی تک کسی طرف سے اس حکم کی خلاف ورزی کی اطلاع نہیں ملی۔ ادارۂ اقوام متحدہ کے بھیجے ہوئے فوجی مبصر ریاست میں اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں اور مزید مبصر آنے والے ہیں۔ التوائے جنگ کے حکم کو رسمی طور پر منظور کرنے کیلئے ۱۵ جنوری کو نئی دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے اعلیٰ فوجی افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں حکم کی رسمی منظوری کے ساتھ پاکستانی افواج اور قبائلی و پاکستانی مجاہدین کے اخراج، قیدیوں کے تبادلہ اور دونوں طرف فوجوں کی مقامی ترتیب کے متعلق متفقہ سفارشات کی گئیں۔ کمیشن کے ارکان واپس آ چکے ہیں۔ اب اگلا قدم عارضی صلح کے معاہدہ کی توثیق ہوگا۔ ناظم استصواب کے تقرر اور استصواب کے دوسرے لوازمات کی تفاصیل اس کے بعد طے ہوں گی۔

بین المملکتی کانفرنس کراچی

پاکستان و ہندوستان کے ذمہ دار قائدین کی طرف سے بارہا کہا گیا ہے کہ دونوں مملکتوں کی دوستی کا دار و مدار قضیۂ کشمیر پر ہے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب دہلی میں

بین المملکتی کانفرنس ہوئی، کشمیر میں آتش و خون کی بارش جاری تھی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو جب دونوں مملکتوں کے نمائندے ایک بار پھر کراچی میں جمع ہوئے، کشمیر میں التوائے جنگ کے سبب فضا زیادہ خوشگوار اور دوستانہ ہو چکی تھی۔ سہ روزہ کانفرنس کے بعد اُن لوگوں کی جائداد کی فروخت و تبادلہ کے متعلق ایک معاہدہ طے پایا جو اپنے اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اب تک ہندوستان نے اس قسم کے معاہدات کی پابندی سے جس طرح پہلوتہی کی ہے اس سے بجا طور پر یہ خدشے ظاہر کئے جا رہے ہیں کہ اس سودے میں حسب سابق پاکستان ہی خسارے میں نہ رہے۔ یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم، سودا بازی کا برتر ملکہ رکھنے کی وجہ سے، اپنی جائدادوں کی فروخت تبادلہ کا انتظام کر سکیں لیکن ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ ہوا تو چنداں آسان نہیں ہوگا۔ جو غیر مسلم پاکستان کے وجود کو اپنی ایک بڑی سیاسی شکست سمجھتے ہیں وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی دولت میں حقیر سا اضافہ بھی ہونے پائے۔

ہندوؤں کے فوجی عزائم

ہندو مہا سبھا جو سیوک سنگھ کی عسکریت کا سیاسی مظاہرہ ہے کچھ عرصہ مصلحت کے پردوں میں رہ کر پھر نکل آئی ہے۔ ۲۷ر دسمبر کو اس کا احیاء سیاسی جماعت کی حیثیت سے کرنے کے بعد ۱۰ر جنوری کو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر مکرجی نے نئی دہلی میں اخباری نمائندوں کی ایک محفل میں پاکستان کے متعلق ان عزائم کا اظہار کیا کہ وہ تقسیم ہند کی غلطی کو درست کرنے کے لئے فوجی ذرائع استعمال کریں گے لیکن "ابھی نہیں"۔

میدان سیاست میں پھر سے آنے کا فیصلہ کرتے ہی مہا سبھا نے حکومت ہند سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ راشٹریہ سیوک سنگھ پر سے پابندیاں ہٹا لے۔ ڈاکٹر سیتا رامیہ نے ۹ر جنوری کو امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے سیوک سنگھ کو "بہادر" کہا "جس نے ۱۹۴۷ء میں اچھا کام کیا"! ادھر ۱۱ر جنوری کو دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ انکشاف کیا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ نے ایک اور سکیم تیار کی تھی جس میں یوپی کے بعض مسلمان گاؤں کو "سرخ پنسل" سے نشان لگایا گیا تھا، یعنی سنگھ کا پروگرام ان گاؤں میں مسلمانوں کا قتل عام برپا کرنے کا تھا۔ اس پس منظر میں حکومت کے نمائندوں نے ——— پٹیل کے ایما پر ——— گول والکر قائد سنگھ سے جیل میں ملاقات کی اور سنگھ کو ایک پارٹی کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا بشرطیکہ سنگھ اپنا آئین ضبط تحریر میں لے آئے گویا وہ ایک خفیہ پارٹی نہ رہے۔ سرکاری حلقوں میں تائید کی فضا دیکھ کر سنگھ نے ۲۰ر جنوری کو تحریک سول نافرمانی واپس لے لی تھی۔ اس تحریک میں کم و بیش پچاس ہزار نفوس گرفتار ہوئے جن میں بیشتر بچے، لڑکے اور سکولوں اور کالجوں کے طالب علم تھے۔ حکومت نے ایک طرف ان گرفتار شدگان کو بچے اور طالب علم سمجھ کر رہا کرنا شروع کیا اور دوسری طرف یکم فروری کو قائد سنگھ سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ حکومت جس انداز سے سنگھ کے سامنے جھکی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت بڑھتے ہوئے اندرونی خلفشار سے کس قدر عاجز آ چکی ہے۔

بھوپال کی باری

حیدر آباد کو "فتح" کرنے کے بعد اب بھوپال کا کانٹا نکالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس

ریاست کا حکمران مسلمان ہے جو بہت عرصہ پہلے ہندوستانی یونین میں شرکت کا اعلان کر چکا ہے۔ اس شرکت کو کافی نہیں سمجھا گیا اور اس ریاست کے خلاف اس قسم کی تحریک شروع کر دی گئی ہے کہ اسے یونین کے علاقے میں مدغم کر دیا جائے تاکہ ہندوستان کی اکھنڈتا میں کوئی خلا نہ رہ سکے۔ حکمران نے اس کا فیصلہ ریاستی باشندوں کی رائے پر چھوڑنے کا اعلان کیا ہے لیکن (بیرونی) ہندوؤں کو یہ وقت طلب جمہوری طریق مطمئن نہیں کر سکتا۔ قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس "داغ" سے ہندوستان کے دامن کو بہت جلد پاک کر دیا جائے گا۔

انڈونیشیا اور ایشیائی کانفرنس دہلی

۱۹۴۸ء کے اواخر میں ولندیزیوں نے انڈونیشیا میں جو جارحانہ اقدام کیا تھا اس نے مہذب دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایشیائی ممالک نے بالخصوص اس شدید ضرورت کا پہلے سے کہیں زیادہ احساس کیا کہ فرنگی استعماریت کو روکنے کے لئے انھیں لفظی ہمدردیوں اور احتجاجوں سے زیادہ کچھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو برما کی تجویز پر وزیر اعظم ہندوستان نے نئی دہلی میں انیس ایشیائی اقوام کی ایک اہم کانفرنس مدعو کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ انڈونیشیا میں سال کے آخر تک انڈونیشیا کی مکمل خود مختار ریاستہائے متحدہ کا قیام عمل میں لایا جائے، جمہوریہ کے قائدین کو رہا کر دیا جائے اور ولندیزی افواج جارحانہ حملے سے پہلے کی صدود تک ہٹ جائیں۔ کانفرنس نے مارچ میں عارضی حکومت کے قیام اور اس کے چھ ماہ بعد مجلس دستور ساز بلانے کا مطالبہ بھی کیا۔ مجلس تحفظ کو یہ قراردادیں بھیجتے ہوئے زور دیا گیا کہ ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں وہ ضروری اقدام کرے۔ بعض مندوبین کی رائے تھی کہ اگر مجلسِ تحفظ اس قسم کا ضروری اقدام نہ کرے تو کانفرنس کو ولندیزیوں کے خلاف خود کارروائی کرنی چاہئے۔ اگر ایشیائی کانفرنس کوئی اس قسم کا انتظام کر سکتی تو اس سے انڈونیشیا کے مقصد کو زیادہ تقویت پہنچ سکتی۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا تاکہ اس کانفرنس کو ادارۂ اقوام متحدہ کے متوازی ادارہ نہ سمجھ لیا جائے۔ اس "غلط فہمی" کا امکان کم کرنے کے لئے کانفرنس سفارشات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ادارۂ اقوام متحدہ جو دولِ عظمیٰ کی اغراض کا اکھاڑہ ہے، مظلوم اقوام کی امداد کیسے کر سکتا ہے۔ اس سے اب مزید توقع رکھنا بے معنی ہے۔ ولندیزی رویہ ایشیائی اقوام کو بالآخر عملی اقدام پر مجبور کر دے گا۔

ہندوستان کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ یہ ایشیائی کانفرنس حیدرآباد ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ چنانچہ ڈچ نمائندے نے مجلس تحفظ میں ہندوستان کو حیدرآباد سے متعلق الزامی طعنہ بھی دیا۔

پیشتر ازیں مجلسِ تحفظ کا یہ مشورہ کہ لڑائی بند کر دی جائے ہالینڈ نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجلس حسبِ دستور رسمی کارروائیوں میں الجھی رہی اور انڈونیشی خون سے ولندیزیوں کا دامن رنگین تر ہوتا گیا۔ حملے کے چھ ہفتے بعد مجلسِ تحفظ نے ایک اور قرارداد منظور کی جسے ولندیزیوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ انڈونیشیا میں قیامِ امن کی ذمہ داری کلی طور پر ان کی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو کسی اور کے حوالہ نہیں کر سکتے۔ ولندیزیوں کے اس اعلان نے مجلسِ تحفظ کی قرارداد کو بے حقیقت بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جمہوریہ کے وجود سے بھی انکار کر دیا ہے، وہ جانتے ہیں

کہ بین الاقوامی ضمیر کی آواز کیا ہے۔ انڈونیشی حریت خواہ بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ ان کی آزادی کو ایک ہی چیز برقرار رکھ سکتی ہے اور وہ ہے ان کی جاں بازی۔ انڈونیشی گوریلا جنگ میں ماہر ہیں اور انڈونیشیا اس جنگ کے لئے سازگار بھی ہے۔ ولندیزی افواج مجاہد دستوں کی سرگرمیوں کو روک نہیں سکیں بلکہ اطلاعات کے مطابق انھوں نے ولندیزیوں کے لئے خاصی مشکل صورت حال پیدا کر رکھی ہے۔

قضیۂ فلسطین کا نیا دور

مجلس تحفظ نے اب تک قضیۂ فلسطین کو جس طریق پر نپٹانے کی کوشش کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عربوں کی ابتدائی فتوحات شکست میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

اس کے برعکس یہود کے حوصلے اس حد تک بڑھے کہ انھوں نے برطانیہ کو بھی آنکھیں دکھانی شروع کر دیں۔ برطانوی فوجیں شرق اردن کے شاہ عبداللہ کی امداد کو عقبہ بھیجی گئیں۔ یہود نے اس مقام پر برطانوی فوجوں کی موجودگی کو ایک معاندانہ فعل سمجھا اور مجلس تحفظ سے اس کے خلاف شکایت کی۔ یہودی یلغار مصر کی سرحدات کو بھی عبور کر گئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کے مطابق برطانیہ نے مصر کے دفاع کو اپنی ذمہ داری سمجھا۔ اس موقع پر مصر کے دفاع سے زیادہ اس کا مقصود مصر کو یہ احساس دلانا تھا کہ اس کی خود مختاری کو خطرہ ہے اور اس خطرہ کے مقابلے کے لئے برطانوی افواج کی موجودگی از بس لازمی ہے۔ مصر نے اس موقع پر دانشمندی کا ثبوت دیا اور وہ انگریز کے دام میں نہیں آیا۔ وہ ۱۹۳۶ء کے مردود معاہدہ کی رو سے انگریز سے امداد کا طلبگار نہ ہوا۔ یہود نے برطانیہ کی ان حرکات کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے ہوئے مصری سرحدات کے اندر پانچ برطانوی ہوائی جہاز گرا دیئے۔ اور جب برطانیہ نے اسرائیل کو اس کے خلاف احتجاجی مراسلہ بھیجا تو یہ "پتہ کی غلطی" کے سبب واپس کر دیا گیا۔ یہ مراسلہ "فلسطین میں اسرائیلی حکام" کے نام تھا "حکومت اسرائیل" کے نام نہ تھا۔ برطانیہ کو پتہ کی اس غلطی کا جلد احساس ہو گیا۔ اس غلطی کو درست کرنے کے لئے بعد میں برطانیہ اور اس کے ساتھ کئی ایک اور ممالک نے حکومت اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔

اسرائیلی حکومت کے عزائم و رجحانات کا قیاس اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ ان دو یہودیوں کو جو سابق ثالث کونٹ برناڈوٹ کے قتل کے الزام میں آٹھ سال قید کی سزا بھگت رہے ہیں، رہا کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک کو یہودی مجلس دستور ساز کا رکن بھی منتخب کر لیا گیا ہے۔

اب تک دنیا کی چونتیس اقوام اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر چکی ہیں اور توقع ہے کہ مستقبل قریب میں بعض اور اقوام بھی تسلیم کر لیں گی۔ ہماری اس خوش اعتقادی کے باوجود کہ یہود قیامت تک اپنی حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ وہ اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی سٹیٹ اس وقت ایک حقیقت بن چکی ہے۔ فطرت کے اصول ہمارے بے بنیاد عقائد کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس مسلّمہ حقیقت کو مصر اور شرق اردن بھی عملاً تسلیم کر چکے ہیں اور حالات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ عراق اور شاید دوسرے عرب ممالک بھی جلد اسے تسلیم کر لیں۔ اب تک ان عرب ممالک نے یہود کے ساتھ مذاکرات سے اصولاً گریز کیا ہے۔ لیکن ابتدائی دور کے بعد جہادِ فلسطین نے جو رخ بدلا ہے اس سے عرب دنیا میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ اس ہیجان کے عملی مظاہرہ وہ واقعات ہیں جو مصر میں علی التواتر ہوئے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو وزیراعظم نقراشی پاشا کا قتل عوامی احتجاج کی ایک خوفناک شکل تھی[1]۔ نئے وزیراعظم ابراہیم ہادی پاشا نے برسرحکومت آتے ہی جو پروگرام پیش کیا اس میں مصر و برطانیہ کے متنازعہ معاہدہ ۱۹۳۶ء کی تنسیخ اور سوڈان کی واگذاری کی مساعی پر زور دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہود کے ساتھ براہ راست مذاکرات صلح کی تلخ گولی کو نگل لیا گیا۔ تصفیۂ فلسطین کے قائم مقام ثالث ڈاکٹر رالف بنش کی تحریک پر جزیرہ روڈز میں مصر نے یہود کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنا منظور کر لیا۔ قائم مقام ثالث نے دوسرے عرب ممالک کو بھی اسی قسم کی گفتگو کے لئے دعوت دی جسے توقع شرق اردن نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ عراق یقیناً اس دعوت کو رد نہیں کرے گا۔ اس طرح عرب لیگ کے رکن ممالک اس حقیقت کو عملاً تسلیم کر رہے ہیں کہ یہود مشرق وسطیٰ میں ایک ایسے عنصر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں کہ جسے نظرانداز کرنا مشکل ہے۔

یہودی حکومت مشرق وسطیٰ کے قلب پر مہلک ناسور ہے۔ امریکہ اس کی پشتیبانی کر کے اور عربوں میں نفاق پیدا کر کے بظاہر روس کے مقابلہ میں اپنے قدم مضبوط کر رہا ہے، لیکن درحقیقت وہ کمیونزم کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جتنا خلفشار بڑھیگا اسی قدر کمیونزم کے لئے فضا سازگار رہیگی۔ وہ وقت دور نہیں کہ امریکہ اپنے اس رویہ پر متاسف ہوگا۔

گندے انڈے گلی میں

بدقسمت پنجاب کا وہ ٹکڑا جو ریڈکلف کے بے لگام قلم سے بچ کر پاکستان کے حصے میں آیا تھا اپنوں کے ہاتھوں جس بے دردی سے پامال ہوا وہ ایک جانکاہ تفصیل ہے۔ مغربی پنجاب کے لئے ستر لاکھ مہاجرین کی آبادکاری اور جنگ کشمیر کا بار ہی کچھ کم نہ تھا کہ اس کے ارباب حکومت اور ارباب سیاست کی کشمکش نے اس کی کمر ہی توڑ ڈالی۔ اٹھارہ ماہ تک صوبہ میں لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ استحکام وزارت اور حصول وزارت کی مساعی میں ایک ایک آدمی کی جنس ایمان خریدنے کی کوشش کی گئی۔ عوام ضروریات زندگی کی قلت، اشیاء کی غیر معمولی گرانی اور افسروں کے جور و تعدی کے ہاتھوں نالاں تھے لیکن ہمارے نیرو بدستور بنسری بجاتے رہے۔ آخر دست بالا نے ان گندے انڈوں کو گلی میں پھینک دیا۔ ۲۶ جنوری کو پنجاب کے متخالف گروہوں میں ایک بار پھر زورآزمائی ہونے والی تھی۔ وزیراعظم پاکستان جناب لیاقت علی خاں اس وقت تک لاہور پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے دونوں قائدین ممتاز و ممدوٹ کا عندیہ معلوم کیا۔ اس موقع پر دنیا نے پنجاب کے منتخب نمائندوں کے کردار کا ایک عجیب نمونہ دیکھا۔ اسلام کے نام پر ووٹ لیکر ملت کی نمائندگی کرنے والے ارکان اسمبلی نے اپنی جنس کس طرح بڑی بولی کے لئے سامنے کر رکھی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگتا ہے کہ جناب ممتاز نے وزیراعظم پاکستان کو ان بیالیس ارکان کے دستخط پیش کئے جنھوں نے

---

[1] مصر کے حالات پرامن نہیں۔ نقراشی پاشا کے قتل کے بعد جماعت اخوان المسلمین کو توڑ دیا گیا۔ اس جماعت کا دعویٰ تھا کہ اس کے ارکان کی تعداد پانچ لاکھ سے زائد تھی۔ ۱۲ فروری کو اس جماعت کے قائد حسن البنا کو قتل کر دیا گیا۔ افریقہ کا شمالی ساحل "مشرق و مغرب" کی کشمکش کی آماجگاہ بن رہا ہے۔

انھیں (ممتاز صاحب کو) اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا۔ اس لحاظ سے انھیں ارکان کی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جناب ممدوٹ نے اپنی حمایت میں تینتالیس[۴۳] ارکان کے دستخط پیش کئے۔ گویا سات ارکان ایسے تھے جن کے دستخط دونو طرف تھے[۱]۔ اس صورت حال کی موجودگی میں یہ توقع عبث تھی کہ صوبہ میں کوئی پائدار وزارت بن سکتی ہے۔ آخر ۲۴ر جنوری کو مغربی پنجاب کی وزارت اور اسمبلی کو معطل کر کے صوبہ کی عنانِ اختیار آئین کی دفعہ ۹۲ الف کے ماتحت گورنر کے حوالے کر دی گئی۔ اس اقدام کا سبب یہ بتایا گیا:

> رشوت ستانی نے بلاشبہ پبلک لائف کا معیار پست کر دیا ہے اور سازشوں نے ملازمتوں کا ضبط نظم بگاڑ دیا ہے۔ حکومت صرف چند اشخاص کے مفاد کے لئے چلائی جا رہی ہے اور عوام کی توقعات اور ضروریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس صورتِ حال کے ذمہ دار بہت سے اسباب ہیں لیکن گورنر جنرل کی رائے میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسمبلی کے ارکان نے جو مختلف حالات میں منتخب ہوئے تھے آزادی سے پیدا شدہ بڑی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کیا۔

صوبے میں عام انتخاب کا اعلان کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ

> وہ کسی ایسے امیدوار کو کامیاب نہ ہونے دیں جو ناجائز مقاصد کیلئے انتخاب لڑنا چاہتا ہو اور صرف انہی امیدواروں کو ووٹ دیں جن کا مقصد وحید ملک و ملت کی خدمت ہو۔

اس طرح صوبے کے رستے ہوئے ناسور کو کاٹ دیا گیا ہے۔ پنجاب کے عوام نے اطمینان کا سانس لیا ہے کہ ان کے اجتماعی و انفرادی مصائب کے ذمہ دار اب ان کے سروں پہ مسلط نہیں رہے۔ یہ طبعی تسکین قابلِ فہم ہے لیکن غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے عوام میں اس قدر سیاسی شعور ہے کہ وہ بددیانت، خود غرض اور نااہل آدمیوں کو اسمبلی میں جانے سے روک سکیں گے۔ سرمایہ، رسوخ اور برادریوں کی جنگ میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا اہل شخص اسمبلی کا رکن بن سکے جو ان "تینوں" اوصاف "سے محروم ہو؟

گورنر پنجاب نے ایک الیکشن کمیٹی کا تقرر کر دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ انتخابات جتنا جلدی ممکن ہوا ہو جائیں گے۔ گورنر نے بیکار سرکاری جریدہ "استقلال" کو بند کر دیا ہے نیز محکمہ احیائے اسلام کو بھی ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ نتائج سے اس محکمہ کے باقی رکھنے کا جواز نہیں ملتا۔

مغربی پنجاب کے جلدی بعد ۴ر فروری کو سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش کو وزارتِ عظمیٰ سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کے خلاف جو متفرق الزامات ہیں ان کی تحقیقات ابھی ابتدائی منازل میں تھی کہ قاضی محمد اکبر کے انتخاب کے خلاف جی ایم سید کی عذرداری سننے والے ٹریبونل نے پیر صاحب کو اسمبلی کی نشست سے محروم کر کے اُن کو چھ سال تک ووٹ دینے کا حق بھی چھین لیا۔ ان کے خلاف جعلی ووٹ ڈلوانے کا الزام تھا۔ پیر صاحب کی

---

[۱] یہ صورت حالات پنجاب سے ہی مختص نہیں۔ سندھ میں حال ہی میں وزارت بازی اور وزارت سازی کا جو کھیل کھیلا گیا اس میں کئی ارکان اسمبلی نے دس دس مرتبہ قرآن پر حلف اٹھائے اور علیحدہ علیحدہ فریقین کو اپنے ووٹوں کا یقین دلایا۔

کی وزارت کے ایک رکن محمد اعظم کچھ روز پیشتر حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب فوت ہو چکے تھے۔ باقی دو وزیروں میں سے میر غلام علی تالپور کو عارضی حکومت کا وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ وزارتِ عظمیٰ کی خالی نشست کے لئے صوبے میں بھر دوڑ شروع ہو گئی۔ اس صوبہ میں بھی مغربی پنجاب کی طرح آئین معطل کرنے کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی لیکن وقتی طور پر گورنر راج سے "بچاؤ" کی صورت یوں تلاش کر لی گئی ہے کہ کراچی کے مشہور سیٹھ مسٹر یوسف ہارون کو جو سندھ اسمبلی کے رکن بھی نہیں تھے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اپنا لیڈر منتخب کر لیا اور گورنر سندھ نے انھیں دعوتِ وزارت سازی بھی دیدی۔ چنانچہ سندھ کی وزارت نے حلف بھی اٹھا لیا ہے۔ جناب ہارون کو انتخاب میں صرف تین ووٹوں کی اکثریت حاصل ہو سکی (۸۱ از ۵۱) جو چنداں خوش آئند نہیں۔ لیکن ہندوؤں اور یورپی ارکان کی تائید بھی انھیں حاصل ہو گئی ہے نیز یوں بھی حکومت حاصل ہو جانے کے بعد کئی منکرین یقینی مریدین میں بدل جاتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ وزارت پہلی سندھی وزارتوں کی طرح غیر مستحکم رہتی ہے یا اسے کچھ دوام حاصل ہوگا اور سندھ صوبہ کے لئے اصلاح و ترقی کے مواقع میسر آسکیں گے۔

صوبہ سرحد میں آئینی صورت حال اس حد تک نہیں پہنچی لیکن وہاں کے حالات ایسے نہیں کہ ان پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ اسمبلی کے اندر برسرِ اقتدار جماعت کی مخالفت بے حقیقت ہے۔ اس لئے وہاں کی حکومت کو فوری طور پر اپنے مستقبل کے متعلق کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اسمبلی کے باہر خان عبد القیوم خاں کی موثر مخالفت ہے۔ لیگ کے تازہ انتخابات میں یہ مخالفت نمایاں طور پر ابھری ہے۔ اس وقت سرحد کی لیگ سے پیر مانکی شریف کا گروہ بالکل بے دخل ہے۔ یہ غیر پارلیمانی مخالفت قیوم خاں کی حکومت کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اس گروہ کی طرف سے صوبے میں عام انتخابات کا مطالبہ کیا گیا ہے کیونکہ جیسا کہ ظاہر ہے، موجودہ اسمبلی عوام کی ترجمان نہیں رہی۔ جاگیرداری نظام کے خلاف مزارعین میں بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ آزادیٔ تحریر و تقریر کی پابندیوں نے صورتِ حالات کو اور پُر خطر بنا دیا ہے۔

مشرقی بنگال میں مغربی پاکستان کے صوبوں کی طرح باہمی گروہ سازی نمایاں نہیں ہو سکی لیکن بد انتظامی نے عوام کو بے قرار کر رکھا ہے۔ جاگیرداری کی گرفت بدستور ہے۔ برما میں کمیونسٹوں کی بغاوت نے مشرقی پاکستان میں کمیونزم کے نفوذ کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ جاگیرداری کی انسانیت سوزیاں اس خطرہ کو ہر وقت دعوت دے رہی ہیں۔ گورنر جنرل پاکستان کے ارشاد کے مطابق کمیونسٹ چاولوں کی نایابی اور قیمتوں کی گرانی کو بطور پراپیگنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ رشوت ستانی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سال ۱۹۴۸ء کے دوران میں محکمہ انسداد رشوت ستانی نے ۶۱۶۰ (چھ ہزار ایک سو ساٹھ) افسروں اور دیگر ملازموں کو ماخوذ کیا۔ ان میں اکثریت محکمہ سول سپلائی کے ملازمین کی ہے۔ ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع بازی، ناجائز برآمد، چور بازاری، تصرفِ بیجا، کنٹرول کے قواعد کی خلاف ورزی، خیانتِ مجرمانہ، دھوکہ دہی وغیرہ کے جو واقعات مختلف تھانوں میں رجسٹر کئے گئے ان کی تعداد ۵۴۸۵۹ (چون ہزار آٹھ سو انسٹھ) ہے۔ ان اعداد و شمار سے صوبے کی انتظامی کیفیت پورے طور پر

سامنے آجاتی ہے۔

مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال کے صوبائی معاملات کی حالت جب اس حد تک پہنچ چکی ہو تو کیا پاکستان کے استحکام و تحفظ کے پیش نظر یہ مناسب نہیں کہ صوبائی خود مختاری کے اس فریب کو ختم کر دیا جائے اور سارے پاکستان کو، یا کم از کم مغربی پاکستان کو ایک انتظامی وحدت بنا دیا جائے اور صوبوں کو بالکل ختم کر دیا جائے؟ یہ اقدام جہاں آئے دن کی صوبائی وزارتوں کی کشمکش کو ختم کر دے گا وہاں سب جانب سے پاکستان کو سبکدوش کر دے گا۔ موجودہ حالات میں صوبائی کشمکش اور صوبائی عصبیت کو روکنے کی اس سے بہتر صورت ممکن نہیں۔

فسادِ رنگ

وسط جنوری میں دنیا نے جنوبی افریقہ میں فسادِ رنگ کا ایک بھیانک منظر دیکھا۔ دولت مشترکہ کی اس رکن حکومت نے عرصے سے اپنے ملک کے ان باشندوں کو ہر قسم کے مدنی حقوق سے محروم رکھا ہوا ہے جو حادثۂ پیدائش کے سبب سیاہ رنگت کے ہیں۔ پاکستان و ہندوستان نے اس خلاف انسانیت سلوک کے خلاف بارہا احتجاج کیا اور مہذب دنیا کو رنگ کی ان پابندیوں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی۔ جنوبی افریقہ کے کالوں نے اپنے حقوق منوانے کی خاطر براہ راست اقدام بھی کیا لیکن اس تمام تگ و تاز کا اثر الٹا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت جو کام متفرق قوانین کے ذریعہ مکمل نہ کر سکی وہ غنڈہ گردی کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ وسط جنوری میں مقامی حبشیوں کے ذریعے باہر کے کالوں کو پٹوایا گیا۔ چوبیس گھنٹے تک ڈربن میں لاقانونیت کا دور دورہ رہا جسے روکنے کے لئے حکومت نے کوئی اقدام نہ کیا۔ اس غنڈہ گردی میں نقصانِ مال کے علاوہ ڈیڑھ سو کے قریب انسان ہلاک کر دیئے گئے اور کئی سو زخمی ہوئے۔ ہنگری کے پادری کو بغاوت کے جرم میں عمر قید کی سزا ملنے پر ضمیر مغرب بے تاب ہو گیا لیکن جنوبی افریقہ میں انسانوں کی ہلاکت سے نہیں بلکہ انسانیت کی ہلاکت سے پہ تہذیب کے کسی گوشے میں بھی جنبش نہ ہو سکی۔

شاخِ نازک پہ آشیانہ

چین کی بیس سالہ خانہ جنگی کا جو الناک حشر ہوا ہے وہ اس کے ہمسایہ ممالک کے لئے ہی نہیں بلکہ ان تمام ممالک کے لئے سامان عبرت ہے جن کی حکومتیں اپنے اور عوام کے درمیان خلا رکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو بیٹھی ہیں کہ ان کی مسندِ اقتدار کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔ جنرل چیانگ کائی شک کی حکومت چینیوں کیلئے بے اطمینانیوں اور مایوسیوں کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ چین کا اندرونی نظام اسی رشوت خوری اور بددیانتی سے کھوکھلا ہو چکا تھا جس کے مظاہر ہم پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک کا کھوکھلا نظام کسی بڑی ٹھوکر کی تاب نہیں لا سکتا۔ چین میں چیانگ کائی شک کی عبرتناک شکست کمیونسٹوں کی برتر قوت سے زیادہ جمہور کے مسلسل اضطراب کی نتیجہ ہے۔

(باقی مضمون برصفحہ ۷۵ ملاحظہ فرمایئے)

معارف القرآن

(پیش رس جلد دوم۔ رسالت)

معارف القرآن کا تفصیلی تعارف جلد اول میں کرایا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ تمام جلدیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اس لئے ہر مرتبہ اس تفصیلی تعارف کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جلد پیش نظر جن اہم مباحث پر مشتمل ہے ان کے متعلق البتہ کچھ تمہیداً عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ صدی یورپ نے ایک نئے نظام تمدن کی بنیاد رکھی جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کردی۔ اس تہذیب کی اساس درحقیقت کائنات کے متعلق اس تصور پر تھی جو وہاں کے علمائے فطرت (سائنسدانوں) نے اپنی طبیعیاتی تحقیقات کے بعد قائم کیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مادہ (Matter) ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور طبیعی قوانین کے ماتحت اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ انہی تبدیلیوں سے کسی نہ کسی طرح میکانکی طور پر (Mechanically) زندگی پیدا ہو گئی، اور اس سے آگے مزید ارتقائی منازل کے بعد شعورِ انسانی وجود میں آگیا۔ لہذا ان کے نزدیک انسان ایک مشین سے زیادہ کچھ نہ تھا جس کے پرزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا ہو جانے سے اس میں زندگی اور شعور پیدا ہو گیا اور جب ان پرزوں میں انتشار ہو جائے گا تو یہ مشین چلنے سے رک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ایک طبیعی پیکر سے زیادہ کچھ نہ تھا تو اس کے تقاضے بھی طبیعی زندگی (Physical Life) سے بیش نہ تھے۔ ان ہی تقاضوں کی تسکین، انسان کا نصب العین تھا۔ پھر چونکہ ہر نوع (Species) کی ہستی کے قیام و بقا کے لئے بقاللاصلح (Survival of the fittest)[1] کا قانون جاری و ساری تھا۔ اس لئے نوعِ انسانی کو بھی اپنے تحفظ کے لئے قوت فراہم کرنے کی ضرورت تھی جو تسخیرِ فطرت سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ یعنی زمین، آسمان، خشکی، تری، پانی، ہوا۔ غرضیکہ کائنات کی تمام طبیعی قوتوں کو مسخر کر لینے سے جو زیادہ قوت حاصل کر لے وہی

[1] اس نظریہ کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس میں حیوان کی "اصلیت" اور انسان کی "اصلیت" میں فرق نہیں کیا گیا اور دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ دیا گیا۔

زندہ رہنے کا حقدار تھا۔ ان ہی قوتوں کا مالک، ڈارون کا "اصلح انسان" اور نیٹشے کا "فوق البشر" تھا۔ افراد سے آگے بڑھ کر یہی جذبہ قوموں میں پیدا ہوا۔ لہٰذا یورپ کے نظام اجتماعی کی بنیادیں بھی اسی تصورِ حیات پر قائم ہوئیں۔ اب ہر قوم زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لینے کی فکر میں تھی جس کے لئے مادی اسباب و ذرائع کے سرچشموں پر قابو پا لینا ضروری تھا۔ اس سے اقوام میں باہمی رقابت پیدا ہوئی اور رقابت سے عداوت۔ نتیجہ ظاہر ہے اندھی قوتوں سے بھرپور ہوائی جہازوں کو فضا میں چھوڑ دیجئے اور طیارہ بازوں (Pilots) کو ان سے الگ کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا قیامت برپا ہوتی ہے۔ یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ انسان، بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح منتشر و پریشان حال۔ اور پہاڑ، دھنی ہوئی اون کی طرح فضا میں اڑتے پھرتے۔ وَدُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا زمین ٹکڑے ٹکڑے۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً ۝ قوموں کی قومیں خاسر و نامراد۔ تھکی ماندی جہنم کی آگ میں جھونکی جا رہی ہیں۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝

غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کا یہی وہ مآل تھا جس کو بھانپ کر وہاں کے مفکرین نے اپنے زاویۂ فکر و نظر کو بدلا اور کائنات کے متعلق ایک نئے اسلوب سے غور کرنا شروع کیا۔ اس غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم فطرت (طبیعیاتی سائنس) کا وہی قصرِ مشید جسے انیسویں صدی میں اس قدر محکم اور پائیدار تصور کیا جاتا تھا بیسویں صدی کے اوائل میں ہی اس کی شکست و ریخت شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادیں تک اکھڑ دی گئیں اور انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتدا، سائنس کی کارگری سے کی۔ اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں، زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل ایسے سہل نہیں ہیں۔
>
> (Mason, Creative Freedom. P.184.)

اب مادہ کی وہ حیثیت باطل قرار پا گئی جو اسے انیسویں صدی کے محققین نے عطا کی تھی۔ مادہ کا تجزیہ کر کے اسے سالمات (Molecules) میں تقسیم کیا گیا۔ سالمات، انفرادی جوہروں (Atoms) میں منقسم ہوئے اور (Atoms) کے متعلق تحقیق ہوا کہ یہ برقیات (Electrons) کی مثبت اور منفی قوتوں کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا مادہ کی اصل و حقیقت غیر مادی (Immaterial) قرار پا گئی اور مادہ کا بہ حیثیت مادہ کے خاتمہ ہو گیا۔ بقول پروفیسر (Mcdougall)

> (Atoms) ختم ہو چکے ہیں۔ مادہ نے اپنے آپ کو توانائی (Energy) میں تحلیل کر دیا ہے اور توانائی کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ہے؟ (صدارتی خطبہ ۱۹۲۳ء)

اور جب یہ بنیاد ہی غلط ٹھہری تو اس پر استوار عمارت کب قائم رہ سکتی تھی! لہٰذا اب کھلے کھلے طور پر کہہ دیا گیا کہ

ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم آغاز آفرینش کی تحقیق کے لئے قانون فطرت (Natural Law)

کو اپنا راہ نما بنا سکیں۔

اس کے بعد زندگی کے متعلق یہ اعتراف ہوا کہ وہ بھی مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی اساس ماورائے مادہ ہے اور شعورِ انسانی بھی مادہ اور حیات کے میکانکی امتزاج کا نتیجہ نہیں (تفصیل ان امور کی وحی کے عنوان میں ملیگی) جب مادہ اور زندگی کے متعلق نگاہوں میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تو پھر کائنات کے متعلق انیسویں صدی کے مادی تصور نے انسانی نظامِ اجتماعی پر جو زہر آلود اثرات مرتب کئے تھے، وہ بھی ایک ایک کر کے بے نقاب ہونے شروع ہو گئے اور حساس قلوب پکار اٹھے کہ اس دور کی تباہی کا راز کیا ہے بقول میسن۔

> بڑھتی ہوئی مادی خواہشات کی تسکین کے لئے کشمکشِ زندگی نے یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل کر دی کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ غیر مادی روحانیت میں ہے۔ . . . چونکہ سائنس نے مادی کامیابی عطا کر دی، اس لئے ہم سائنس کی اسی طرح پرستش کرنے لگ گئے جس طرح ہمارے بزرگ جادو کی پرستش کیا کرتے تھے۔ یہ روش، درحقیقت اس زندگی سے فرار کی راہ تھی جس میں انسانی خودی اپنے استحکام کے لئے ضبطِ نفس کی متقاضی تھی اور ضبطِ نفس یقیناً ایک مشقت طلب مرحلہ ہے۔ . . . ہوتا یہ ہے کہ جس قدر مادی ترقی بڑھتی جاتی ہے، خودی کی محبوبیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ہے ہمارے دور کی ناکامی کا اصلی راز۔ خوشحالی اس قدر فراواں ہے کہ بایدو شاید۔ عیش و عشرت کے سامان ہر مقام پر موجود ہیں۔ مادی کامیابی کے مواقع، نچلے سے نچلے درجہ کے انسانوں تک کے لئے کھلے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ، انسان بیحد غیر مطمئن اور مضطرب و بیقرار ہے۔ . . . . تخلیق کی قوتِ محرکہ کبھی مستقل طور پر ایسے نظریہ کو سینے نہیں لگائے رکھ سکتی جو انسانی ذات کو محض مادہ کی نمود قرار دے۔ ایسے نظریہ کے ماتحت افراد اور قومیں دونوں تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔

اب زندگی کے تقاضے بھی طبیعی زندگی کے تقاضوں تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے متعلق، آکسفورڈ یونیورسٹی کے فلسفہ کے استاد (Dr. William Brown) کے الفاظ میں، تسلیم کیا گیا کہ یہ تقاضے

> قلبِ انسانی کے وہ بنیادی رجحانات ہیں جن کی براہِ راست ترجمانی عقلِ انسانی نہیں کر سکتی۔
>
> (Hibbert - Journal　April - 1925.)

اسی لئے اب اخلاقی ضوابط کی اقدار (Values) کے معیار بھی مختلف قرار پا گئے اور فیصلہ کیا گیا کہ۔

> اخلاقیات کی قدر و قیمت نفسِ انسانی کے تحت متعین ہونی چاہیے۔ اس لئے ہم انسانوں کے باہمگر تعلقات کو کتنا ہی افادی حیثیت (Utilitarianism) پر مبنی قرار دے لیں، انسان کا جو تعلق خود اس کی اپنی ذات سے ہے، اسے ہم غیر مادی ماننے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ انسان کو اپنے مادی مفاد کو (زندگی کے تقاضوں کے) تابع رکھنا ہو گا تاکہ وہ اس کی ذات کے استحکام سے ایک بلند قدر و قیمت حاصل کر لیں۔

فطرتِ انسانی کا صحیح تقاضا کیا ہے؟ اسے میسن دورِ حاضرہ کے انسان کے قلبی اضطراب کو سامنے رکھ کر، ان

الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ہمارے دور میں جس چیز کی کمی ہے اور جس کی وجہ سے یہ اپنی ناقصیت کو محسوس کر رہا ہے وہ انسانی خودی کی ہے جس کی نمود، مادہ اور روح دونوں میں ہونی چاہیئے۔ انسان مادی کامرانیوں میں ڈوبا ہوا، پریشان اور ایک عجیب الجھاؤ میں ہے اس لئے کہ اس کی ذات اپنے آپ کو مادہ سے بلند نہیں لیجا سکتی بلکہ مادہ کے اندر ڈوبی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ اس کا اضطراب اس لئے ہے کہ اس کا تحت الشعور یہ چاہتا ہے کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ مادہ سے جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے خود ان سے کچھ بیش ہے۔ وہ مادی کارگری کو بحال رکھنا چاہتا ہے اس لئے کہ یہ اس کی قوت تخلیق کی مدد کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادیت سے بلند لے جائے اور اس کی ذات کا اندازہ اس کی مادی تخلیق سے نہ لگایا جائے بلکہ اس سے کہ وہ خود کیا ہے؟ (P. 183)

لیکن جس تہذیب کی بنیاد اس تصور پر ہو کہ ماورائے مادہ کسی شے کا وجود نہیں اس میں انسان اپنی ذات کو بھول کر (فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ) ایک مادی مشین بن کر رہ جاتا ہے جس سے رفتہ رفتہ اس کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ تہذیب مغرب کا یہی تباہ کن نتیجہ تھا جس کے متعلق مشہور فرانسیسی مفکر (Rene Guenon) لکھتا ہے۔

عہد حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے ....

اس عہد کے انسان نے نہ صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے۔ یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں اس لئے کہ یہ ان قوتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جن کی اصلی حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انھیں استعمال کرتے ہیں۔ . . جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود ان ہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ . . . دور حاضرہ میں مادی قوانین کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مادہ اس انسان کو برباد کر دے گا جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر مادہ کی تسخیر چاہتا ہے۔ اسلئے کچھ بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ہی ایجادات کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

(The Crisis of the Modern World)

ان ہی حقائق کے پیش نظر یہ مغربی مفکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:۔

مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ صرف یہی نہیں کہ وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوع انسانی کو

۱؎ کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق (اقبالؒ)

بھی اپنے منتشر (افکار) اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ یورپ کے تصورات کی دنیا میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ یہی وہ انقلاب تھا جسے مغرب کے تحت الشعور میں بھانپ کر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

> لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

یہ انقلاب جو انسانی ضمیر میں اس طرح پہلو بدل رہا تھا، اپنی نمود کے لئے شاید ابھی کچھ اور وقت لے لیتا۔ لیکن موجودہ جنگِ عالم اسے کھینچ کر بہت قریب لے آئی ہے۔ یورپ اب ایک مرتبہ پھر زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے لیکن چونکہ اس کے پاس وحی کی روشنی نہیں اس لئے وہ نئے راستہ کا فیصلہ بھی فکرِ انسانی کی مدد سے ہی کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اسے خود اس حقیقت کا احساس ہو چکا ہے کہ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی ترجمانی عقل نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ پھر ایک غلط راہ اختیار کرے گا جس کا خمیازہ ایک مرتبہ پھر ساری دنیا نے انسانیت کو اٹھانا پڑے گا۔

لیکن جن کے پاس وحی کی روشنی ہے ان کی حالت خود یورپ سے بدتر ہے۔ وہاں قلبی تسکین کا سامان نہیں لیکن کم از کم مادی ترقیاں تو کہکشاں گیر ہیں۔ لیکن یہاں تو یہ حالت ہے کہ

> بےکسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!!

یہ ایک رسمی نوحہ نہیں جس کا آج کل عام طور پر رواج سا ہو چکا ہے اور اس لئے وہ اپنا اثر بھی زائل کر چکا ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو خود فریبی کے ہزار پردوں سے بھی چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو اپنی آخری کتاب کی وراثت کے لئے منتخب کیا تھا جسے نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ حیات بننا تھا۔ اس کے لئے انھیں ایک نظامِ زندگی (دین) عطا کیا گیا تھا جو ہر غیر فطری نظام کے لئے پیامِ موت تھا۔ اس نظام کا فطری نتیجہ وہ سب کچھ تھا جس کی تلاش میں دنیا آج یوں سرگردان و حیران پھر رہی ہے اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، یعنی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انھیں **حیات** کے تقاضوں (حدود اللہ) کے تابع رکھنا تاکہ انسانیت ارتقائی مراحل طے کر کے اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ

(Mason) جس کی تصنیف کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں، برگساں کا تبع اور اس کے نظریہ تخلیقی ارتقاء کا ایک معنی میں شارح ہے۔

غیر محسوس طور پر دین دھرم بنتا چلا گیا اور بالآخر وہی نظام جس نے اپنی حرارت سے کائنات کی رگوں میں ایک تازہ خونِ زندگی دوڑایا تھا، سمٹ کر چند نظری معتقدات اور افسردہ رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا[1]۔ یہ عبرتناک تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ یہ ایک حدیث ہے دل گداز اور سانحہ ہے الم انگیز جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی قوم جسے اقوامِ عالم کی امامت کے لئے منتخب کیا گیا تھا، زندگی کے میدان سے باہر نکال دی گئی۔

اب مرورِ زمانہ سے اس کی یہ روش کچھ اس طرح عین زندگی بن چکی ہے کہ اس میں ذرا سی تبدیلی (بلکہ تبدیلی کا تصور) ان کی روح کو کپکپا دیتا ہے۔ تہذیب کا مشہور مورخ (Briffault) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

> مشرق کے جمود کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہاں ہر شے مقدس بن چکی ہے جسے چھونا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔
> (The Making of Humanity)

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو وحی کی روشنی کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے جو زندگی کے عملی مسائل سے کنارہ کش ہو چکی ہو اور مکڑی کی طرح اپنے گرد جالا تن کر اسے حصارِ عافیت سمجھ بیٹھی ہو؟ بقول سپنگلر

> جو عقائد اپنے زمانہ کی زندگی کی گہرائیوں پر حملہ آور ہو کر اسے متاثر نہیں کرتے، بہتر ہے کہ ان کی تعلیم ہی نہ دی جائے۔ (ص ۳۴۳)

جو قوم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ آگے بڑھنے والوں کی خوبیوں پر نگاہ نہیں رکھتی بلکہ ان کے نقائص کی تجسس میں رہتی ہے۔ یہ لوگ ان تیز دوڑنے والوں کی ٹھوکروں پر ہنسی اڑاتے ہیں اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر جھوٹا اطمینان دے لیتے ہیں کہ ہمارے پاؤں تو زخمی ہونے سے بچ گئے! لیکن نہیں سمجھتے کہ وہ تو پھر بھی مادی ترقیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ تگ و دو حیات میں تو کہنے والے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ

> کوشش بیہودہ بہ از خفتگی (رومیؒ)

آج ہماری یہی حالت ہو چکی ہے۔ ہم نے نہ یورپ کی تسخیرِ فطرت کی بے پناہ قوتوں کو دیکھا اور نہ ہی علمی تحقیقات میں ان کے محیر العقول کارناموں پر نگاہ ڈالی۔ دیکھا تو ان کے صہبائے ارغوانی و جامِ بلوریں اور ساقِ سیمیں و سینۂ عریاں کو دیکھا اور "لاحول" پڑھ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیا کہ حسنات ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی تمام برائیاں قابلِ نفرت ہیں لیکن ان کی مذمت کرتے وقت ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر ان کی وہ "بے دینی" انھیں جہنم میں لے جائے گی تو ہماری یہ "دینداری" بھی جس کا نتیجہ

> محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید

---

[1] (The Decline of the West) کا مشہور مصنف (Spengler) اس حقیقت کو بالفاظِ دگر یوں بیان کرتا ہے کہ ہر پیغام اپنے ساتھ ایک کلچر لاتا ہے۔ اس کلچر کی تشکیل ایک تمدن (Civilisation) سے ہوتی ہے جس کا مقصد اس کلچر کی حفاظت ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کلچر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور خالی تمدن باقی رہ جاتا ہے۔ مسلمان ہزار برس سے اسی تمدن کی پرستش کر رہا ہے اور اسی کو اصل دین سمجھے بیٹھا ہے۔

کے سوا کچھ نہیں، ہمیں جنت کا مستحق نہیں بنا سکے گی کہ من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ۔ لیکن یہ حقیقت اسی پر بے نقاب ہو سکتی ہے جو اقوامِ عالم کے (اور خود اپنے) اعمال کا محاسبہ قرآن کی میزان سے کرے۔ لیکن آج مسلمان میں اتنی جرأت کہاں؟ اس لئے کہ یہی محاسبہ اس کے غلط اطمینان کے پردوں کو اٹھا کر حقیقت کو اس طرح بے نقاب کر دیتا ہے کہ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا کہ انسان بیساختہ چیخ اٹھتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا؟

اب ظاہر ہے کہ جب یہ قوم خود اپنی راہ نمائی کے لئے قرآن کی روشنی سے بہرہ یاب نہیں ہوتی تو دوسروں کو مشعلِ ہدایت کیا دکھائے گی! اس لئے حقیقت یہ ہے کہ دنیا جن غلط روشوں پر (ضد اور سرکشی سے نہیں بلکہ صحیح روشنی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے) چلتی رہی ہے اور آج بھی چلی جا رہی ہے اس کی ذمہ داری مسلمان کے سر بھی کچھ کم عائد نہیں ہوتی۔ اسی کی سزا ہے کہ اپنے پاس دنیا کی قیادت کا سامان رکھنے والی قوم، دنیا کی نگاہوں میں اس قابل بھی نہیں رہی کہ اس کی بات تک بھی سنی جائے۔ وذالك ھو الخسران المبین۔

لہذا آج اس دوراہے سے اگر یورپ پھر غلط راستہ کی طرف مڑ گیا تو اس غلطی کا فطری نتیجہ (یعنی یہ کہ اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور ہٹاتا جائے گا) تو اسے بھگتنا پڑے گا، لیکن اس دوراہے پر متعین کردہ چوکیدار بھی جو چراغِ راہ کو اپنی گدڑی میں لپیٹے سو رہا ہے، بازپرس سے نہیں بچ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خطرہ اور بھی ہے۔ دنیا کے انقلابات کے تھپیڑوں نے مسلمانوں کی نئی پود کو نیند سے بیدار تو کر دیا ہے لیکن ڈر ہے کہ وہ آنکھیں ملتے ملتے (پھر ایک مرتبہ) اسی غلط راہ رو کے پیچھے نہ ہو لے۔

یہ ہے وہ شدید احساس جس نے مجھے معارف القرآن لکھنے پر آمادہ (بلکہ مجبور[1]) کیا۔ میرا اولین مخاطب نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور اسی کو میں شروع سے پکار رہا ہوں۔ زیر نظر جلد میں خصوصیت سے وہ مباحث آ گئے ہیں جن کے صحیح طور پر واضح نہ ہونے سے ان کا دامن، شکوک و ارتیاب کی خاردار جھاڑیوں میں الجھا رہتا ہے۔ میں متوقع ہوں کہ وہ ان مباحث کا نہایت غور اور سکون سے مطالعہ کریں گے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی چیز تشریح طلب رہ جائے تو اس کے متعلق مجھ سے دریافت کر لیا جائے۔ جس جذب و شوق سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ نے جلد اول کو اپنے سینوں میں جگہ دی ہے اس کے پیش نظر مجھے اپنی یہ توقع بیجا معلوم نہیں ہوتی۔

مغرب نے مادہ کو زندگی کے تقاضوں کے حل کرنے کا اہل سمجھنے میں بڑی فاش غلطی کی، "روحانیت" کے غلط مفہوم سے مشرق نے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ زندگی کے مسائل کا حل ان دونوں کے صحیح امتزاج

---

[1] اس لئے کہ میرا ماحول، فکرِ معاش کے لئے میری دفتری مصروفیات اور پھر دن بدن ساتھ چھوڑنے والی صحت، شاید اس کٹھن منزل کے لئے بآسانی آمادہ نہ ہونے دیتی اگر یہ شدتِ احساس ایسا جبر نہ بن جاتی جس سے ذوق دیوانگی کی حد تک پہنچ جائے۔ میں اس شدتِ احساس کی موہبت پر اس بارگہِ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر بہزار تشکر و امتنان سجدہ ریز ہوں کہ اس نے یہ سوز عطا کیا اور پھر اسے یوں زندگی کا ساز بنا دیا۔

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے　　　اور میری زندگی کا یہی سامان بھی ہے

میں ہے۔ میسن لکھتا ہے۔

سو (آج) زندگی میں روحانی اثرات کی بڑی کمی ہے لیکن وہ غلط روحانیت نہیں جو مادہ کو محض مادہ ہونے کی وجہ سے شر (Evil) خیال کرتی اور انسان کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دورِ حاضرہ میں مادیت کے روحانی مفہوم کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ یعنی ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ خود ہمارا اور مادہ کا سرچشمہ اولیں، مادرا مادہ، ایک روحِ خالص (Pure Spirit) ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ افادی تخلیق (Utilitarian Creativeness) کے ساتھ روح کی آمیزش کس طرح کی جائے۔ اس لئے کہ ہم یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ہماری زندگی کا سرچشمہ مادہ ہے اور مادہ کا سرچشمہ کہیں بھی نہیں! (یوں سمجھئے کہ) ہم یہ نہیں جانتے کہ مادیت اور روحانیت میں کس طرح باہمی توافق پیدا کیا جائے۔ (P. 183)

یورپ کو معلوم نہیں، اور یورپ آج بھی معلوم نہیں کر سکتا کہ مادہ اور روح کی اس مغائرت کو مٹا کر اس میں امتزاج کیسے پیدا کیا جائے۔ یہ تنہا فکرِ انسانی (علم استدلالی) کے بس کی بات نہیں[1]۔ اس کا حل صرف اس چشمۂ علم سے مل سکتا ہے جس سے مادہ اور روح دونوں نے اپنا وجود پایا۔ وہی خالقِ کائنات جانتا ہے کہ ان دونوں کی فطرت کے کیا جوہر ہیں اور ان میں باہمی توافق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ قرآن اسی سوال کا حل پیش کرتا ہے۔ (اور معارف القرآن میں اسی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے)۔ **حیات** کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت (Creative Impetus) کے زور پر بلند سے بلند تر ہوتی جائے۔ تخلیقی قوتوں کی نمود کے لئے اسے مادہ کو بطور مسالہ (Material) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مادہ کے جمود و تعطل (Inertia) کا تقاضا ہوتا ہے کہ **حیات** اسی کی چار دیواری میں گھر کر رہ جائے۔ یہی خیر و شر کا مفہوم ہے۔ اسی کو آویزشِ ابلیس و آدم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی آویزش کی مسلسل داستان، تاریخ انسانیت ہے۔ **حیات** کو اس چار دیواری سے ابھر کر بلند ہونے کے لئے اس قوت کی ضرورت ہے جو قوانینِ الٰہیہ کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (۵۵/۳۳) یہ **سلطان** (غلبہ و قوت) قرآن سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

---

[1] نفسِ انسانی کے متعلق، عقل کی رو سے کس قدر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں اس کے متعلق وحی کے عنوان میں تفصیلی تذکرہ آئے گا۔ اس باب میں سب سے آخر، علم تحلیل نفسی (Psycho-analysis) بہت بڑے دعاوی لیکر آگے بڑھا تھا۔ لیکن۔ Dalbiez کے الفاظ میں۔

اس نے نفسِ انسانی کے بنیادی مسائل کو جہاں پایا تھا وہیں چھوڑ دیا۔

(Psycho-analytical Method and Doctrine of Freud)

معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلدیں اسی اجمال کی تفصیل پیش کریں گی جس سے یہ تمام مباحث واضح طور پر سمجھ میں آجائیں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

ان مباحث کو سمجھ لینے کے بعد یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ کام ہو گیا۔ کام تو اس کے بعد شروع ہوگا۔ قرآن فی الحقیقت "کرنے" کی چیز ہے "کہنے" کی نہیں۔ عمل کا ایک ذرہ علم کے ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے گھر سے اسٹیشن کس طرف کو ہے؛ وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ کیا ہے؟ وہاں سے ٹکٹ کیسے اور کتنے میں خریدا جائے گا؟ گاڑی میں کس طرح سوار ہوا جائے گا؟ راستہ میں کیا کیا احتیاط برتنی چاہئیں؟ بالآخر گاڑی پشاور کتنے بجے پہنچے گی؟ لیکن اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ بدستور اپنے مکان پر بیٹھے رہیں گے تو آپ پشاور قیامت تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور قرآن تو ایسی چیز ہے کہ اس پر عمل ہو رہا ہو تو نہ اس کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے نہ سمجھانے میں۔ اس وقت سمجھنے اور سمجھانے میں دقت اس لئے ہو رہی ہے کہ قرآن پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس کا متعین کردہ نظام قائم نہیں لیکن آج جس ماحول میں ہم مقید ہیں اس میں آغاز کار "قرآن کہنے" سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب تک قرآن کریم کی صحیح تعلیم سامنے نہیں آئے گی اور اس کے بصائر و حکم دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر جائیں گے اس وقت تک نہ ہمیں اپنی موجودہ غلط روش کا احساس ہوگا اور نہ ہی طریق کار سامنے آسکے گا۔ اس لئے آپ سب سے پہلے قرآنی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں اور جب ان مباحث کو سمجھ لیں تو اس کے بعد انہیں عملی پیکروں میں ڈھلنے کی تدبیر کریں۔ اس انداز کی تدبیر کہ ہیگل کے الفاظ میں

> اس طرح کام کرو کہ جن نظریات کو تم اپنے عزم و ارادہ سے عمل میں لا رہے ہو انہیں گویا تمام نوع انسانی کے لئے قانون بننا ہے۔ (Vol. 1. P. 362.

اس حقیقت کے پیش نظر میری اپنی یہ کیفیت ہے کہ جتنا کچھ قرآن سمجھ میں آجاتا ہے، اتنے ہی اپنے جرائم زیادہ سنگین دکھائی دیتے ہیں اور شرم محسوس ہوتی ہے کہ خدا کے حضور کس منہ سے جانا ہوگا۔ اندریں حالات، میں قرآن کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھانے کو بھی بہت بڑی جسارت سمجھتا ہوں۔ لیکن بایں ہمہ وہ شدت احساس جس کا ذکر اوپر آچکا ہے مجھے اتنی بڑی جرأت پر یہ کہہ کر آمادہ کر دیتی ہے کہ کہیں وقت کی نزاکت کے پیش نظر آج کا سکوت بھی جرم نہ قرار پا جائے۔

مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

جیسا کہ جلد اول (کے تعارف) میں لکھا جا چکا ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم اسی صورت میں سامنے آسکتی ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر اس میں غور و فکر کریں۔ ہم سفر زندگی میں ذہنی تصورات اور معتقدات کا اس قدر سامان لیکر چلتے ہیں کہ خود اسی کا بوجھ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ضرورت ہوتی ہے کہ ہم کبھی رک کر اس

سامان کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس میں کون کون سی چیزیں غیر ضروری ہیں تاکہ انھیں الگ کر دیا جائے۔ اگر یہ جائزہ قرآن شریف کی روشنی میں لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ بوجھ بہت ہلکا رہ جائیگا یاد رکھئے کہ جو کچھ ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے اس میں غلطی کا امکان ضروری ہے۔ خود سائنس کے نظریات کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چند وہ محسوس مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں ایس ہے (Kenneth Walker) کے الفاظ میں

> یہ نظریے فکرِ انسانی کے لئے سستانے کی جگہ ہیں۔ جب کسی نئی حقیقت کے انکشاف سے معلوم ہو کہ فلاں نظریہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا تو اسے فوراً چھوڑ دینا چاہیئے۔
>
> (Meaning and Purpose)

جب سائنس کی محسوس دنیا میں نظریات کی یہ کیفیت ہے تو مذہب کی غیر محسوس دنیا میں انسانوں کے خود ساختہ معتقدات کس طرح ابدی طور پر واجب التسلیم قرار پا سکتے ہیں؟ **حقیقت** صرف قرآن کے اندر ہے کہ وہ ذہنِ انسانی کی تخلیق نہیں۔ اس لئے وہی غیر متبدل ہے جب حقیقت یہ ہے، تو پھر اور تو اور جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے بھی آخری سمجھ یا منزہ عن الخطا نہ تصور کیجئے۔ اسی طرح جس قدر انسانی تصانیف کے اقتباسات (اور حضرت علامہ اقبالؒ کے اشعار) معارف القرآن میں سامنے آئیں انھیں بھی ان کی حیثیت سے آگے نہ لیجائیے۔ یہ اقتباسات ہوں یا اشعار بلکہ جو کچھ خود میں نے لکھا ہے وہ بھی سب کے سب۔

چراغِ راہ ہیں منزل نہیں ہیں

اگر یہ قرآن کی کسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں تو ان سے قرآن فہمی میں مدد لیجئے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز قرآن کے خلاف جاتی ہے تو بلا ادنیٰ تامل اسے دیوار پر دے ماریئے پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ راستے کے ان چراغوں سے مقصود منزل تک راہبری ہے۔ جب آپ خود منزل (قرآن) تک پہنچ جائیں گے تو پھر راستے کے ان چراغوں کی بھی ضرورت نہ رہے گی، اور یہی میرا مقصود ہے کہ آپ خود قرآن تک پہنچ جائیں۔

جلد اول میں بیان کردہ خاکہ کی رو سے جلد دوم کو رسالت اور جلد سوم کو کتب پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا لیکن ترتیب کتاب کے وقت یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ گئی کہ رسالت اور کتب کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس انداز کے مطابق "کتب و رسالت" کو دو جلدوں میں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن جلد دوم میں تمہیدی مباحث نے ایسی اہمیت اختیار کر لی کہ مجبوراً جلد دوم کو حضرت نوحؑ اور اقوام عاد و ثمود کے کوائف پر ختم کر دینا پڑا اور تیسری جلد میں حضرت ابراہیمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک کے منازل طے ہو سکے۔ ان میں ایک "ضربِ کلیمی" کا عنوان ہی مستقل کتاب ہے۔ جلد سوم کے اخیر میں تمام حضرات انبیائے کرامؑ اور امم گذشتہ کے احوال و ظروف پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس میں قوموں اور ان کی تہذیبوں کے عروج و زوال کے مہات اصول شرح و بسط سے سامنے آ گئے ہیں۔ ازاں بعد ظهر الفساد کے عنوان سے تمام مذاہبِ عالم اور ان کی (مبینہ) آسمانی کتابوں

کی تاریخ تدوین و تحریف پیش کر کے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں کوئی آسمانی تعلیم اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ تھی اور مضطرب نگاہیں کسی قندیلِ جہانتاب کے لئے رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جلد چہارم اسی قندیلِ جہانتاب کے تذکارِ جلیلہ سے مستنیر ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

جلد اول میں بصراحت لکھ چکا ہوں، اور یہاں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود نہ کسی کی تحقیر و تنقیص ہے اور نہ کسی سے بحث و تمحیص۔ میرا مقصد قرآن پیش کرنا ہے۔ اگر قرآنی حقائق سامنے آجانے کے بعد بھی کوئی شخص اپنے کسی غیر قرآنی عقیدہ کو زیادہ محبوب رکھتا ہے تو اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں حق و باطل کی خفیف سی مصالحت کو بھی شرک سمجھتا ہوں کہ حق اگر ذرا بھی اپنے مقام سے سرک جائے تو حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ اگر میرا یہ مسلک کسی پر گراں گزرتا ہے تو میں معذور ہوں۔ کہ

جہانِ او دگر است و جہانِ من دگر است

پھر جی چاہتا تھا کہ ان احباب کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے متذکرہ صدر موانع و مشکلات میں میرا ہاتھ بٹایا۔ لیکن پھر یاد آگیا کہ قرآنی رشتہ، اظہارِ سپاس گذاری و تشکر کی رسمیات سے بلند ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک

کی خاموشیاں وہ کچھ کہہ جاتی ہیں جو بیان و کلام کی ہزار سحر آفرینیاں بھی نہ کہہ سکیں۔

باقی رہی توفیقِ ایزدی! سو اس کے بغیر تو ایک حرف بھی نہ سمجھ میں آسکتا ہے نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اس کے عیوب و اسقام میرے ہیں اور صفات و حسنات اس کی طرف سے مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے کا ہے

پرویز

مارچ ۱۹۵۳ء

معمارانِ پاکستان

(جن کی ہڈیوں کے چونے اور لہو کی سرخی سے پاکستان کا وہ قصرِ جمیل تیار ہوا جسے آج ارباب ہوس اپنا عشرتکدہ سمجھ رہے ہیں)

مجاہدِ سرحد

نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری!

غالباً ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، میں سرحد کے مضافات میں اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہا تھا۔ وہ مضافات جو عمر بھر میرے تصورات کی آماجگاہ اور مستقبل سے متعلق میری امیدوں کا محور بنے رہے تھے۔ میں جوں جوں ہاں بسنے والے آہنی انسانوں کی فطرت و نفسیات کا مطالعہ کرتا، مجھ پر عجیب و غریب راز منکشف ہوتے چلے جاتے۔ سب سے زیادہ تحیر انگیز ان کے سیاسی شعور کی بیداری تھی۔ ان دور دراز مقامات میں جہاں شاید ہی کبھی کوئی اخبار پہنچتا ہو، ہل چلانے والے کسان اور گدھے ہانکنے والے دہقان، مقامی، ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی سیاست سے متعلق اس قسم کے سوالات پوچھتے تھے کہ ہمارے شہروں کے اچھے اچھے لیڈروں کے ذہن میں بھی نہ آسکیں۔ پھر وہ بات کو سمجھتے اس سرعت سے تھے کہ فقرہ آغاز سے فوراً مآل کار تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت افزا ایک اور "آواز" تھی جو ہر مقام اور ہر گوشے سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جس سے بات کی اس نے یہی کہا کہ "ہاں۔ صدر صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔" "صدر صاحب کا بھی یہی فیصلہ ہے۔" "ہم صدر صاحب سے پوچھ کر بتائیں گے۔" میں حیران تھا کہ یا اللہ! یہ صدر صاحب کون بزرگ ہیں جن کے ذکر سے ساری فضا معمور ہے۔ میں یونہی پھرتا پھراتا ایک دن اپنے میزبان کے ہمراہ ایک جرگہ میں جا پہنچا۔ ایک بڑا اہم مسئلہ زیر بحث تھا۔ مخالف و موافق سمت سے شعلہ فگن تقریریں ہو رہی تھیں۔ ہر پٹھان کے پاس اس کی رائفل یا طمنچہ اور کارتوسوں کی پیٹی کمر سے بندھی ہوئی۔ محفل میں اس قدر شدید حرارت پیدا ہو گئی کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ اب یہ پٹھان "متشابہات" سے "محکمات" پر اتر آئیں گے اور فریقین میں گولی چل جائے گی۔ میں نے ایک پاس بیٹھے ہوئے

بڈھے پٹھان سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا! اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "وہی ہوگا جو صدر صاحب کہیں گے"۔ اب میری تمام حیرت سمٹ کر نگاہوں میں آگئی کہ بالآخر آج ان "صدر صاحب" کو دیکھ سکوں گا جن کے تذکروں سے ساری فضا معمور تھی۔ آخری مقرر کی تقریروں کا دھواں ابھی فضا میں گم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک گوشے میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہمہ تن آتش پٹھان، برفانی کاشمیری بن گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹ سے بھی اونچا، تنومند، قوی ہیکل، انسان جھٹکا دیکر اٹھا اور نہایت متانت سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجمع میں سے ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز تھیں۔ سر پر دہقانی ٹوپی کے اوپر ایک چھوٹا سا پٹکا یونہی بے ترتیبی سے لپٹا ہوا۔ چوڑا چکلا چہرہ، سر سید جیسی ڈاڑھی۔ عقاب کی سی چمکدار، روشن آنکھیں۔ لبوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ۔ پنڈلیوں تک ایک لانبا کرتا اور اسی کپڑے کا وہ دہ "راشوں"[1] والا شلوار[2]۔ ایک "چادرا" یونہی ادھر سے اُدھر شانوں سے لٹکتا ہوا۔ کرتے پر ایک صدری جس کا ایک جیب توشہ دان اور دوسرا لیٹر بکس دکھائی دیتا تھا۔ یہ تھے "صدر صاحب" جن سے میں اتنے دنوں سے ہر گاؤں اور ہر قریہ میں غائبانہ طور پر متعارف ہوتا چلا آرہا تھا۔ انھوں نے مجمع پر ایک خاموش لیکن نہایت پر معنی نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد نکھری اور سلجھی ہوئی پشتو میں تقریر شروع کی۔ میں محو حیرت تھا کہ سرحد کے کسی ویرانے میں بیٹھا ہوں یا لندن کی پارلیمنٹ میں۔ ایک "دہقانی پٹھان" کو سن رہا ہوں یا چرچل اور ہٹلر کو (اس زمانہ میں ہٹلر کی تقریروں کی بڑی دھوم ہوا کرتی تھی)۔ تقریر میں بین الاقوامی سیاسیات کا تجزیہ، ہندو کی نگاہِ فریب دسیسہ کاریوں کی نقاب کشائی، تحریک قومیت پرستی کی ابلہ فریبیوں کا کچا چٹھا، مسلم لیگ کے خلاف اعتراضات کے جوابات، سیاستِ حاضرہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی، سب کچھ آگیا اور اس مؤثر انداز سے کہ سامعین میں سے کوئی اونچی سانس تک نہیں لیتا تھا۔ تقریر میں کہیں بجلی کی سی کڑک اور بادلوں کی سی گرج تھی اور کہیں ندی کی بے صوت نغمہ خوانیاں اور پر سکوت روانیاں۔ اس تقریر کے بعد اس مغنیٔ آتش نفس نے مجمع سے پوچھا کہ کہو آپ کا کیا فیصلہ ہے؛ فیصلہ کیا تھا؟ وہی جو مجھ سے اس بڈھے پٹھان نے کہا تھا۔ کسی ایک اختلافی آواز کے بغیر، متفقہ طور پر سب نے اس پر صاد کیا جو "صدر صاحب" نے کہا تھا۔

رات کو میں نے کھانے کے بعد اپنے میزبان کو اٹھنے نہ دیا اور ان سے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ یہ "صدر صاحب" کون ہیں۔ انھوں نے خشک پشاوری تمباکو کا ایک لمبا سا کش لگایا اور حقہ کو اٹھوا کر میرے پاس بیٹھ گئے اور کہا۔

---

[1] سرحد کے اس پار پٹھانوں کو "راشے" کہتے ہیں۔

[2] میں نے قصداً شلوار کو مذکر لکھا ہے اس لئے کہ پٹھان کی شلوار اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اسے مؤنث لکھنا اس کی تنکیر ہے۔

"غالباً سنہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ تحصیل صوابی (ضلع مردان) کے ایک گاؤں 'ٹوانگلی' میں ایک کاشتکار کا نوجوان لڑکا ایک دن اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی والدہ، ہمشیرگان، بیوی، سب کو بلا بھیجا۔ وہ حیرت سے چارپائی کے گرد کھڑی ہوگئیں تو اس نوجوان نے ان سے کہا کہ "تم جی بھر کر رو لو کہ میں تمہارے لئے آج سے مر چکا"۔ یہ تحریکِ خلافت کا زمانہ تھا۔ یہ نوجوان باہر نکلا اور اگرچہ تحریک میں محض ایک رضاکار کی حیثیت سے شامل ہوا لیکن اپنے حسنِ سیرت و کردار اور مخلصانہ عرق ریزیوں اور سرگرمیوں سے علاقہ بھر میں آگ لگا دی۔ عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے بند پڑے ہوئے مدرسے پھر سے کھلوائے۔ گاؤں گاؤں پنچایتیں قائم کیں۔ غرضیکہ اپنے راہ نماؤں کی قیادت اور رفقار کی معاونت سے علاقہ بھر میں تحریک کو ایک نئی زندگی اور زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کر دی۔ اُس زمانہ میں سیاسی تحریکوں میں شرکت آگ سے کھیلنے کے مرادف تھی۔ چنانچہ اس تگ و تاز سعی و عمل کی شدید مخالفتیں ہوئیں لیکن اس شعلہ جوالہ نے کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی ساعی کو جاری رکھا۔ یہ سلسلہ سنہ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا۔ جب افغان جرگہ وجود میں آیا اور رضاکاروں کا نام "خدائی خدمتگار" رکھا گیا جو عوام میں سرخپوشوں کے نام سے متعارف ہوئے۔ اس زمانہ میں خدائی خدمتگاروں کے مقاصد نہایت درخشندہ تھے۔ چنانچہ ٹوانگلی کے اس نوجوان نے اب سرخپوشوں کی تنظیم کا بیڑا اٹھایا اور چند دنوں میں اسے ایک منظم جیش کی شکل دیدی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی شروع ہوئی تو حکومت نے سرخپوشوں کو خلافِ قانون جماعت قرار دیدیا۔ یہ نوجوان گرفتار ہوا اور چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا بھگتنے کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران میں حکومت نے سرخپوشوں پر سخت تشدد برتا جس سے یہ تحریک ماندی پڑ گئی۔ چھ ماہ کے بعد یہ قید سے نکلا تو پھر وہی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اس کا پھر تعاقب کیا تو یہ مفرور ہو گیا لیکن فراری کی حالت میں بھی اپنا کام بدستور کرتا رہا حتیٰ کہ پھر گرفتار ہو گیا۔ اور جیل بھیجدیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گاندھی۔ اروِن سمجھوتا ہوا تو اسے بھی رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے پر پھر وہی گرمجوشیاں شروع ہو گئیں۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوئی تو یہ صاحب روپوش ہو گئے اور حکومت اور پولیس کے علی الرغم روپوشی کی حالت میں برابر جماعت کی تنظیم کرتے رہے۔ حکومت نے تنگ آکر ان کے والد اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ جب اس پر بھی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی تو ان کی جائے سکونت کو نیلام کر دیا اور سامانِ زمینداری کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ ان کا ایک قیمتی باغ کاٹ ڈالا اور مال مویشی سب ضبط کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا۔ ایک مُخبر کی سازش سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور دو سال قید بامشقت کی سزا پا کر پھر حوالۂ قید و بند ہو گئے۔ قید کے بعد رہا ہوئے تو عام انتخابات کا زمانہ تھا۔ انھوں نے انتخابات میں اس برق رفتاری سے کام کیا کہ کانگریسی اراکین کی اکثریت سے ڈاکٹر خان کی وزارت قائم ہو گئی۔ اس فتح و کامرانی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو سرحد تشریف لائے۔ اب یہ نوجوان، عبدالغفار خان کا دستِ راست اور صفِ اول کے راہ نماؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کانگریس کے ایک ایسے ذمہ دار لیڈر سے ان صاحب کی

بے تکلف گفتگو ہوئی۔ ان کی نگۂ ژرف بین ودوررس نے فوراً بھانپ لیا کہ ہندو کے عزائم کیا ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ حالات کیا تھے۔ صوبہ میں کانگریس کی وزارت تھی۔ پورے علاقہ میں سرخپوشوں کا راج تھا۔ عبدالغفار خاں (ملنگ بابا) کی گویا پرستش ہوتی تھی۔ شہرت، عزت، مقبولیت، قوت، سب ایک طرف تھیں۔ لیکن جب اس مخلص نوجوان نے محسوس کیا کہ سرخپوشوں کو کس طرح ہندو عزائم کے لئے آلۂ کار بنایا جارہا ہے تو اس نے ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر، عبدالغفار خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے، ملتِ حنیفہ کے مؤسسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اتباع میں، اعلانیہ کہدیا کہ انا براؤ منکم ومما تعبدون من دون اللہ۔ ہم تم سے اور ان سب سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں۔ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ۔ ہم تم سے بیزار ہیں۔ تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی دشمنی اور عداوت رہے گی تاآنکہ تم ایک اللہ کی چوکھٹ پر نہ جھک جاؤ۔ اس اعلان نے سارے علاقہ میں ایک سنسنی پیدا کردی۔ خان عبدالغفار خاں باور ہی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ وہ خود چل کر تو آگئی آیا اور دو دن تک ان سے مصروفِ افہام وتفہیم رہا۔ بحث وتمحیص، ترغیب وترہیب سب جتن کر دیکھے لیکن ایک بے لوث انسان کا ایمان ایسا کمزور نہیں ہوا کرتا کہ ان حربوں سے لغزش میں آجائے۔ گفتگوئے مصالحت ٹوٹی تو ان لوگوں کی طرف سے اذیت رسانیوں کے مختلف حربے بروئے کار آنے شروع ہوگئے۔ لیکن جس مردِ خود آگاہ کے عزائم کو انگریز کا تشدد کمزور نہ کرسکا تھا اسے کانگریسی اقتدار کی مضرت رسانیاں کیا سرنگوں کرتیں؟ اُدھر سے تشدد تھا اور اِدھر کانگریسی روباہ بازیوں اور اجنبی فریبیوں کے خلاف ہر جگہ کھلی کھلی تبلیغ۔ لیکن اس وقت تک ان کی یہ تمام مساعی تخریبی تھیں۔ یعنی کانگریس کی مخالفت۔ یہ اپنی جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے اور دوسری کوئی جماعت ایسی تھی نہیں جس میں شامل ہوا جائے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ملک میں مسلم لیگ کا چرچا ہو رہا تھا لیکن مسلم لیگ کو تو حکام پرستوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ سرحد میں انگریزی حکومت نے اپنے ہم نواؤں سے ایک "اسلامی جرگہ" بنوایا تھا۔ جو عوام میں بیحد بدنام تھا۔ یہی جرگہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا حامی کہا کرتا تھا۔ اس لئے سرحد کا کوئی مخلص کارکن لیگ میں شمولیت کا نام تک نہ لیتا تھا۔"

میرا میزبان یہاں تک پہنچا تھا کہ ملازم پھر حقہ لیکر آگیا۔ انہوں نے خشک تمباکو کا ایک کش پھر لگایا اور کہنے لگے کہ یہاں تک بات پہنچی ہے تو بہتر ہے کہ تحریکِ مسلم لیگ کا پس منظر بھی سامنے آجائے۔ (واضح رہے کہ میرا میزبان ایک خاموش سا مخلص مسلمان تھا جو نظری حیثیت سے سیاسیات سے بڑی گہری دلچسپی رکھا کرتا تھا اس لئے اس اعتبار سے اس کا تجزیۂ کوائف وحوادث بڑا صحیح ہوا کرتا تھا) انہوں نے کہا:

"آپ کو معلوم ہی ہے کہ انگریزی حکومت نے، ہر بیدار مغز حکومت کی طرح، ایک ایسے طبقہ کی تخلیق کی تھی جو رعایا اور حکومت کے درمیان حاجب ودربان کا کام دے۔ یہ صوبہ سرحد ہی کی بات نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسا کیا گیا تھا۔ قومِ حاکم کے رعب اور اقبال کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ عوام کو

حکام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ لہذا یہ طبقہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، پبلک اور افسروں کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ یہ طبقہ، دیہاتی زندگی میں بڑے بڑے زمینداروں، نمبرداروں، ذیلداروں اور سفید پوشوں پر مشتمل ہوتا تھا، اور شہری زندگی میں نوابوں، خان بہادروں، کرسی نشینوں، آنریری مجسٹریٹوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبروں کو محیط۔ سرحد میں اس طبقہ کو بالعموم خوانین کا گروہ کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ "سگانِ حضوری" تھے اس لئے عوام ان کو ڈرتے تھے۔ پبلک کی تمام مشکلات انہی کے توسط سے حل ہوتی تھیں۔ لہذا عوام کے دلوں میں ان کا "جبری احترام" رہتا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جس راستہ کوئی خان بہادر گذر جاتا، دکاندار دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ کوئی معاملہ ان کی مرضی کے خلاف طے نہ ہونے پاتا۔ جس تقریب میں وہ شامل نہ ہوتے وہ اپنی تکمیل تک نہ پہنچ سکتی حتیٰ کہ لڑکی اور لڑکوں کے رشتے ناطے تک بھی ان کے استصواب کے بغیر قرار نہ پاتے۔ وہ عجیب زمانہ تھا۔ ان کی بڑی دھوم تھی۔

تحریک آزادی نے (جسے ہندوؤں کی زبان میں تحریک سوراج اور مسلمانوں کے الفاظ میں تحریک خلافت کہا جاتا تھا) عزت و احترام کے معیار بدل دیئے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ وہی نواب اور کرسی نشین، وہی سردار اور خان، جن کی گذرگاہوں پر لوگ دو رویہ تعظیم کے لئے کھڑے رہا کرتے تھے، منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ گئے اور ان کے دروازوں پر "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے ماتم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب ان کی کیفیت یہ تھی کہ اگر انہیں کسی اپنی غرض کے لئے بھی حکام کے پاس جانا ہوتا تھا تو راتوں کی تاریکیوں میں چوروں کی طرح چھپ چھپا کر نکلتے اور دبے پاؤں واپس آتے کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ کونسل، اسمبلی تو بڑی چیز تھی، اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لئے بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ رہی۔ اگر کوئی کسی حاکم کی مدد کے بھروسے پر کہیں درخواست دے بیٹھا تو اس طرح ذلیل و خوار ہوا کہ کچھ گرہ سے دیکر جان چھڑانا پڑی۔ ان کے مقابلہ میں لوگوں نے بھنگیوں اور چماروں کو امیدوار بنا کر کھڑا کیا اور دھڑلے سے کامیاب بنا دیا۔ چنانچہ یہ دور پندرہ بیس برس تک جاری رہا اور یہ طبقہ اس طرح گمنامی کے گوشوں میں منہ چھپائے پڑا رہا جس طرح سورج کی موجودگی میں چمگادڑیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ آزادی کی تحریک میں یہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ اس تحریک میں جائدادوں کی ضبطی، تنگدستی اور اس کے بعد حوالاتیں، جیل خانے، چکی کی مشقتیں، مار پیٹ، سامنے نظر آتی تھی۔ لہذا عزت کے تمام دروازے ان پر بند تھے اور ذلت کی تمام راہیں کشادہ کہ اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور قلبِ ملت جناب قائداعظمؒ نے ملت کا مقدمہ، جو سرتاسر حق و انصاف پر مبنی تھا اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہنگامہ آرائیاں اور تلاطم خیزیاں ان کی فطرتِ سلیم کے خلاف تھیں۔ وہ تدبر اور دیانت سے مخالفین کو قائل کرنے کے عادی اور داعی تھے۔ انہیں ضرورت صرف اتنی تھی کہ وہ جس عدالت میں اس عظیم مقدمہ کو لیکر جائیں، قوم کی طرف سے مختارنامہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ ہندوؤں نے ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی ہمنوائی میں (بدبختی سے) مسلمانوں کے اس طبقہ نے بھی جو تحریک آزادیٔ ہند کی گرمجوشیوں میں

پیش پیش رہا تھا ایسا ہی کیا۔ لہٰذا اس میدانِ سیاست میں محترم قائدِ اعظم کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ ان موقعہ پرستوں نے جو کونوں اور کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے، اس خالی میدان کو غنیمت سمجھا۔ انھیں محترم قائد کی سلامت روی اور امن پسندی سے یقین تھا کہ اس میدان میں "خطرہ" کی کوئی بات نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی چھنی ہوئی عزتوں اور کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیابی کے لئے باہر آگئے اور "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعروں سے قوم کے ترجمان بن گئے جیسا کہ کہا جا چکا ہے، محترم قائد کو اپنی بساطِ سیاست کی کامیابی کے لئے ضرورت ہی صرف اس قدر تھی کہ جب بھی کہیں ان سے پوچھا جائے تو کہدیں کہ ہاں! قوم کی واحد نمائندہ جماعت "مسلم لیگ" ہے اور ہمارے مختارِ کار "مسلم لیگ کے صدر" محترم قائد اعظم۔ یہ لوگ نہ پہلے سرکار کے طرفدار کسی عقیدہ اور یقین کی بنا پر ہوئے تھے، نہ اب مسلم لیگ کے حامی کسی بلی نصب العین کے پیش نظر۔ وہ بھی موقعہ پرستی تھی اور یہ بھی موقعہ پرستی۔ قائد اعظم کی فراست اور اخلاص نے اس جماعت (مسلم لیگ) کا وقار جو درحقیقت ان کی ذات سے منسوب تھی، آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا، اور یوں لکڑی کے ساتھ یہ لوہا تیرنے لگا۔ جیسا میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس تحریک میں خطرہ کی تو کوئی بات تھی ہی نہیں۔ تھوڑا سا صرفہ ضرور تھا سو اس عزت کے مقابلہ میں جو انھیں اس طرح حاصل ہو رہی تھی، یہ سودا قطعاً گراں نہیں تھا۔ اب وہی "ٹوڈی بچے" جن کا ماتم "ہائے ہائے" سے ہوا کرتا تھا، "زندہ باد" کے نعروں میں حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا رہے تھے!

یہ تو تھی ملک کی عمومی حالت۔ صوبہ سرحد میں یہ تفاوت اور بھی نمایاں تھا۔ یہاں سرخپوشوں کی تحریک کو دبانے کے لئے انگریز نے ان سرکار پرست نوابوں، سرداروں، "موجب خواروں" اور وظیفہ یابوں کو خاص طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ جس قدر ظلم و تشدد چاہتا تھا، انہی کے ہاتھوں سے کراتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صوبہ کے ایک ایک گھرانے میں ان سرکار پرستوں کے خلاف جذباتِ انتقام و غضب بھڑک رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے "اسلامی جرگہ" عبارت تھا اور بدقسمتی سے یہی وہ تھے جو شروع شروع میں مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اب آپ خود ہی خیال فرما لیجئے کہ اس مسلم لیگ میں سرحد کا مسلمان کس طرح شریک ہو جاتا۔ کانگریسی مسلمان، لیگ کو انگریزوں کی خود ساختہ جماعت کہا کرتے تھے اور اس کے لئے انھیں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیگ کے حامی ان کے اس دعوے کی زندہ دلیل تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں نوابزادہ تنکی کے اس "باغی سرخپوش" نے کانگریس کی مخالفت شروع کی تھی۔ اس کی فراستِ مومنانہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مسلمان کے لئے لیگ کی حمایت ہی صحیح مسلک ہے۔ اب یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ حوصلہ طلب تھا۔ وہاں تو صرف کانگریسی رفقا اور سرخپوشوں کی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانا تھا۔ یہاں اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ پیوست کرنا تھا جو اپنی سرکار پرستی میں گلی کوچے میں بدنام تھے۔ غور کیجئے۔ یہ مرحلہ کس قدر دشوار گذار اور ہمت طلب تھا۔ لیکن اخلاص کے سامنے کوئی مرحلہ بھی مشکل نہیں ہوا کرتا۔ قائد اعظم نے اپیل کی کہ "مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگ رہی ہے اور دین خطرہ میں

گھنٹی بجا رہا ہوں۔ کوئی ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے؟" تو توانگی کے اس مرد مجاہد نے اس درد بھری اپیل کو سنا اور لبیک لبیک کہتا ہوا، ننگ و نام کی پروا کئے بغیر مسلم لیگ میں جا شامل ہوا۔ خود اور اس کے جاں نثار خیلیوں کی ساری جماعت۔ کانگریسی زعما اور سرخپوشوں کے اباطیل نے ایک شور مچا دیا کہ لیجئے یہ بھی ٹوڈی ہو گئے۔ لیکن سرحد کے مسلمانوں کے سامنے اس مرد قلندر کی ساری زندگی تھی۔ وہ علی وجہ البصیرت جانتے تھے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص انگریز پرست ہو جائے۔ لہٰذا جس طرح ان حکام پرست لیگیوں کا وجود ہی لیگ کو سرکار پرست جماعت قرار دینے کی زندہ شہادت تھا، اسی طرح اس مرد بیباک اور اس کے رفقاء کار کی لیگ میں شمولیت، لیگ کو سرکار پرستی کے ملعون لیبل سے بچانے کی دلیل قاطع اور برہان نیرہ تھی۔ انسان کا کیرکٹر دشمنوں سے بھی اس کا لوہا منوا دیتا ہے۔ پہلا بحران ختم ہونے کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ جب کبھی کانگریسیوں کی طرف سے یہ طعن دیا جاتا کہ لیگ انگریز پرستوں کی جماعت ہے اور جواب میں یہ کہہ دیا جاتا کہ کیا ارباب توانگی بھی انگریز پرست ہیں، تو ان کا منہ بند ہو جاتا۔

اب لیگ کچھ اور تھی۔ اب گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ لیگیں بننی شروع ہو گئیں۔ بسنہ ۱۹۳۸ء میں یہ مرد مجاہد تحصیل صوابی کی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ بس اس دن سے ان کا نام ہی "صدر صاحب" ہو گیا۔ صدر صاحب ایک غریب زمیندار تھے۔ اپنا اثاثہ پہلے لٹوا چکے تھے۔ لیگ کی تنظیم کے لئے روپیہ کہاں سے آتا؟ پہلے اپنا مکان رہن رکھا۔ پھر زمین رہن رکھی (یہ چیزیں حکومت کانگریس کے زمانہ میں واگذار ہو گئی تھیں) یہ سال بھر دورے میں رہتے تھے اس لئے کھیتی باڑی کی نگرانی کس طرح ممکن تھی؟ بہرحال سارا صوبہ ان کا مدح خواں اور ستائش گر تھا۔ ان کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لوگ ان نوابوں اور سرداروں پر اعتراضات کرتے تھے جو لیگ کے سربراہ بن رہے تھے۔ اس زہر کا اثر زائل کرنے کے لئے انھیں اشخاص اور اصول کے فرق کو ذہن نشین کرانا پڑتا تھا جو ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے اخلاص و کردار سے علاقہ بھر کو لیگ کا گرویدہ بنا دیا۔ اس "جہاں گردی" سے کھیتی باڑی کا سب دھندا برباد ہو گیا۔ اور گھر کے اخراجات بھی قرض سے چلنے لگے۔ اپنے علاقہ میں تو پھر بھی مکی کی روٹیاں چادر میں باندھ کر پاپیادہ سفر ہو جاتا تھا۔ لیکن مشکل اس وقت آتی تھی جب لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے باہر جانا پڑتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لیگ کے ہر اجلاس میں شرکت کے لئے انھیں ایک ایک کھیت رہن رکھنا پڑتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں صوبے کے انتخابات ہوئے اور صدر صاحب صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

جب مسلم لیگ کو اس طرح مقبولیت حاصل ہو گئی تو قوت و جاہ طلب افراد کے دلوں میں وزارت کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ "صدر صاحب" نے انھیں اس ارادہ سے روکا۔ ان کا یہ فیصلہ نہایت تدبر و فراست اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت لیگ کا جو بھرم بنا ہوا ہے وہ ان ارباب ہوس کی اقتدار پرستیوں سے خاک میں مل جائیگا۔ لیکن ان کی کسی نے نہ مانی اور خان اورنگ زیب خاں نے لیگ وزارت مرتب کر لی۔"

اب ملازم قہوہ لیکر آگیا اور میرے میزبان نے ایک فنجان مجھے تیار کرکے دیا اور ایک فنجان خود اٹھایا۔ صدر صاحب کے متعلق داستان اس قدر دلچسپ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ قہوہ کا فنجان جلدی سے ختم ہو جائے۔ لیکن پٹھان ایسا گرم قہوہ پیتے ہیں کہ اسے سانس کے زور سے کھینچکر پیتا دیکھ یوں کہئے کہ چکھنا پڑتا ہے۔ پیالی ختم ہوئی تو میرے میزبان نے سلسلہ کلام کو پھر جاری کیا اور فرمایا۔

" اب سنو کہ کیا ہوا۔ وہی صدر صاحب جن کی مساعی کے صدقے ان خوانین کو یہ مسانید حکومت و اقتدار نصیب ہوئی تھیں، ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ ہر غلط حرکت پر روکتے تھے اور بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ان کی تمام کارروائیوں کا کڑا جائزہ لیتے تھے۔ لہذا سوچا گیا کہ اس کانٹے ہی کو پہلو سے نکال دینا چاہئے۔ چنانچہ آئین و قوانین کی تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اورنگ زیب خاں صاحب و رفقاء ہم نے بنوں کے ایک صاحب کو صوبہ لیگ کا صدر بنا دیا اور صدر صاحب کو صدارت سے الگ کر دیا۔ اس فیصلہ سے سارے علاقہ میں آگ لگ گئی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس آگ کا بجھانے والا کون ہے؟ خود " صدر صاحب "۔ یہ جگہ جگہ پھر رہے ہیں اور لوگوں کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے لیگ کو نقصان نہ پہنچانا۔ آج کے جس جلسہ میں آپ گئے تھے وہ بھی اسی غرض کے لئے منعقد ہوا تھا۔ لوگ تلے بیٹھے تھے کہ لیگ کو درہم برہم کر دیا جائے۔ " وہ " صدر صاحب اور لیگ " کو دو الگ الگ چیزیں تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہی فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ کو الٹ دینے والے بھی صدر صاحب تھے۔ یہ تماشا تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے "۔

اس وقت نصف شب کے قریب گذر چکی تھی۔ میرا میزبان مجھے شب بخیر کہہ کر چلا گیا اور میرے لئے تصورات کی ایک دنیا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ بار الہا! ہم میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا یہ عالم ہے۔ میں اس سے پیشتر یہ باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کہ ہمارے بوسیدہ بادلوں میں ہنوز ایسی ایسی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ علی الصبح میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے نوانکی جا نکلا تاکہ اس مرد مومن کے ہاتھوں کو بوسہ دے سکوں۔ لیکن وہ گذشتہ شب کسی اور طرف " دورہ " پہ نکل گئے تھے وہاں، بہرحال، میں ان کے رفقائے کار سے ملا اور وہاں سے بھی بہت کچھ سنا۔ صدق مقال اور اکل حلال کی جن داستانوں کو ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال نوانکی کے ان لوگوں کی زبانی سنا۔

اب صوبہ کی حکومت نے، ہر مستبد حکومت کی طرح، صدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ الزام تراشی، تہمت طرازی، پولیس کی نگرانی و قس علی ذلک۔ ہر وہ حربہ جو حق گوئی اور بیباکی کے جرم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے، استعمال کیا گیا۔ وہ اس قسم کی اذیت رسانیوں میں مصروف تھے اور صدر صاحب اس کوشش میں سرگرم مارے مارے پھر رہے تھے کہ عوام لیگ کے خلاف نہ ہو جائیں۔ لیکن اب یہ ناسور، صدر صاحب کی کوششوں سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ناؤ کو انسان کی دعائیں بچا نہیں سکتی تھیں۔ لیگ حکومت کی بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں اس درجہ بڑھ چکی تھیں کہ وہ پٹھان جنہیں انگریز کے تصور سے نفرت تھی، دعائیں

مانگتے تھے کہ اس حکومت کے بدلے دفعہ ۹۳ کے ماتحت گورنری راج ہی آجائے۔ یہی تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صدر صاحب صوبہ میں لیگ وزارت کے قیام کے خلاف تھے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی خود صدر صاحب سب سے بڑھ کر مشکل میں تھے۔ کانگریسی مسلمان جگہ جگہ انھیں طعن دیا کرتے تھے کہ کیوں! یہی ہے وہ آزاد حکومت جس کے لئے تم ہم سب سے الگ ہوئے تھے۔ مسلم لیگی عوام جو محض صدر صاحب کی کوششوں سے لیگ میں شامل ہوئے تھے، حکومت کی بدعنوانی کے لئے صاحب صدر کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اور حکومت کا ان کے ساتھ جو سلوک تھا اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لیگ کے مقصد سے ان کا عشق تھا کہ انھیں سلئے پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ لیگ وزارت سخت بدنام ہوگئی اور اس کے بعد خود اپنے بوجھ ہی سے ٹوٹ گئی۔ صدر صاحب نے قیام وزارت سے پہلے ہی اس کے انجام کے متعلق جو کچھ کہہ رکھا تھا، وہی کچھ ہو کر رہا۔ اب پھر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برسر اقتدار تھی اور لیگ کے لئے حالات سخت ناساعد اور صدر صاحب کے لئے فضا بیحد ناسازگار۔ لیکن وہ اس پر بھی برابر مصروفِ سعی و عمل رہے کہ ناسازگار ماحول سے متاثر ہو کر مایوس ہو جانا ان کی فطرت ہی میں نہیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں فسادات ہوئے تو سرحد سے ایک تحقیقاتی کمیٹی، صدر صاحب کی صدارت میں تفتیش حالات کے لئے بمبئی گئی۔ وہاں سے واپسی پر صدر صاحب کو دہلی میں معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سرحد جانے والے ہیں۔ صدر صاحب کی نگاہ اس موقعہ کی اہمیت کو بھانپ گئی انھوں نے وہیں سے پراونشل مسلم لیگ سرحد کے سکرٹری صاحب کو تار دیا کہ صوبہ لیگ کا ایک اجلاس خصوصی فوراً طلب کیا جائے۔ صدر صاحب خود، پنڈت جواہر لال کے سرحد پہنچنے سے تین دن قبل پشاور پہنچ گئے اور لیگ کے اجلاس میں اس مسئلہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا کہ اراکین کو اپنے ساتھ ہمنوا کر لیا۔ اب ان تین دن میں، صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے وہاں کیا کچھ کیا، اس کا جواب اس سے لیجئے کہ جواہر لال صاحب کے ساتھ سرحد میں کیا کچھ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سے دیگر دردمند اور صاحب ہمت حضرات کی کوششیں بھی شامل تھیں لیکن صدر صاحب اور ان کے رفقاء کا اس میں نمایاں حصہ تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلہ پر حملہ کرنے کے الزام میں صدر صاحب پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔

اسی دوران میں حلقہ مردان میں ایک ضمنی انتخاب سامنے آیا جس کے متعلق ڈاکٹر خان صاحب نے دہلی سے چیلنج دیا تھا کہ کانگریس اور لیگ کی فتح و شکست کا مدار اسی انتخاب پر ہے۔ یہ صدر صاحب کا اپنا علاقہ تھا۔ اس میں انھوں نے اس تن دہی اور جانفروشی سے کام کیا کہ اللہ کی نصرت نے ان کی مساعی کو کامرانی سے نوازا اور انتخاب لیگ کے حق میں ہوا۔ اب صدر صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ صوبہ میں کانگریس کا زور توڑنے کے لئے حکومت سے تصادم ضروری ہے۔ لہٰذا انھوں نے مردان سے سول نافرمانی کی ابتدا کر دی

اور پھر پشاور پہنچکر اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا پروگرام مرتب کرلیا۔ اتنا کرنے پائے تھے کہ حکومت نے انھیں گرفتار کرکے جیل خانہ بھجوا دیا۔ اس موقعہ پر قدرت نے حضرت پیر صاحب مانکی شریف (داعلی اللہ مدارجہ) کو اس طرف متوجہ فرما دیا اور انھوں نے اس ہمت، جرأت، اور بیباکی سے اس تحریک کو کامیاب بنایا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ (حضرت پیر صاحب کے مجاہدانہ تگ و تاز اور اس کا "صلہ" ایک الگ داستان ہے اور فرصت کی محتاج)۔ صدر صاحب کو جیل گئے قریب چھ ماہ ہوئے تھے کہ سرحد میں ریفرنڈم کا چرچا ہوا۔ اب جو ان کی رہائی ہوئی ہے تو انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حق و باطل کا آخری معرکہ ہے۔ اس معرکہ میں حق کی کامیابی کے لئے صدر صاحب نے صوبہ بھر میں بگولے کا سا رقص کیا اور وہاں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ (اُدھر حضرت پیر صاحب مانکی شریف کے مجاہدانہ سعی و عمل نے فضا کا رنگ بدل دیا) اللہ نے ان مخلص کارکنوں کی کوششوں کو اپنی توفیق و تائید سے نوازا اور سرحد میں ہندو کی سازشیں ختم ہوگئیں — والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کے بعد پھر لیگ وزارت قائم ہوگئی اور پھر وہی خود غرضانہ وسیسہ کاریاں شروع ہوگئیں۔ حضرت پیر صاحب کے ساتھ وہاں کیا کیا گیا یہی حدیث کچھ کم جگر خراش نہیں، لیکن اس سے کہیں الم انگیز ہے یہ داستان کہ صوبہ سے اس تشتت و انتشار کو ختم کرنے کے سلسلہ میں صدر صاحب نے جو جد و جہد کی اسے متعلقہ حلقوں میں غلط معنی پہنائے گئے۔ بے غرض انسان کے ساتھ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ یہ خلفشار بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں جہادِ کشمیر شروع ہوگیا اور یہ اللہ کا بندہ سیدھا میدانِ جنگ میں جا پہنچا۔

پچھلے دنوں سرحد میں مسلم لیگ کے انتخاب جدید ہوئے اور جس طریق سے یہ انتخاب عمل میں آئے اگر اس کی تفاصیل بیان کی جائیں تو ہر قلبِ حساس کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ انتخاب تو ایک طرف، رکنیت کے فارم تک بھی ایک خاص حلقہ سے باہر نہیں جانے دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں حضرت پیر صاحب مانکی شریف کو جس طرح کراچی کے چکر لگانے پڑے وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فارم، صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار (یا حضرت پیر صاحب اور ان کی جماعت) کو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔ ان جیسے "باغیوں" کا بھلا لیگ میں کیا کام؟

اب صورت یہ ہے کہ نوانگلی کا یہ مردِ مجاہد جس کی تمام عمر مسلمانوں کو سربلند دیکھنے اور اپنے صوبہ میں پاکستان کا علم بلند کرنے میں صرف ہوگئی اور جس نے اس مقصدِ عزیز کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا اب پاکستان کی "اسلامی حکومت" میں، اپنے گاؤں کے ایک حجرے میں معتوب و مغضوب پڑا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس "کانٹے" کو پہلو سے نکالنے کے لئے اربابِ ہوس و اقتدار کس کس قسم کے نشتر استعمال کریں۔ جرم اس کا صرف یہی کہ قالوا ربنا اللہ۔ یہ کہتا ہے کہ جھکنا صرف خدا کے حضور جائز ہے۔ اور سب اس کے بندے اور مخلوقِ خدا کے خادم ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جن مقاصد کا اعلان کرکے قوم کو دعوئ پاکستان کا ہمنوا

بنا یا تھا ان وعدوں کو پورا کرو۔ خدا کے بندوں کو خدا کی محکومی میں رکھو۔ پاکستان کو غریبوں کی امیدوں کا ماویٰ و ملجا بننے دو۔ اسے اپنی کامرانیوں کا جہنم نہ بناؤ۔ آج ایسا کہنے والے کی سزا اس سے بھی سخت ہونی چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر صدر صاحب آج بھی چاہیں تو صوبہ میں لیگ کے مقابل ایک فعال جماعت قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن دولت میں تفرقہ کسی قیمت پر بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ خود مٹ جائیں گے لیکن قوم میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیں گے۔

بہرحال یہ ہیں مختصر سے کوائف زندگی مسلمانِ پاکستان میں سے اس ایک کے جس کی ہڈیوں کے چونے اور لہو کی سرخی سے یہ قصرِ جمیل تیار ہوا ہے اور جو اب اربابِ ہوس کا عشرتکدہ بن رہا ہے۔

اگر آپ اس مردِ مجاہد سے ملنا چاہیں تو ضلع مردان کے گاؤں نواکلی میں جائیے۔ وہاں بخت جمال خان کہہ کر نہ پوچھئے کہ گاؤں کے نو عمر لڑکے اس نام سے آشنا نہ ہوں گے۔ "صدر صاحب" کہکر دریافت کیجئے تو پانچ برس کا بچہ بھی آپ کو سیدھا اس کھیت کی طرف لے جائے گا جہاں پاکستان کا یہ لعلِ جلیل کہ جس کا مقام آج سب سے بلند ہونا چاہیئے تھا گھاس کھود رہا ہوگا۔

"حق شناس"

(ہم محترم "حق شناس" کے بدل شکر گذار ہیں کہ انھوں نے پاکستان کے ایک ایسے لعلِ گراں قدر کے تفصیلی کوائفِ حیات سے ہمیں روشناس کرایا۔ طلوعِ اسلام پاکستان کے اس فرزندِ جلیل کی خدمت میں اپنی جھکی ہوئی نگاہوں سے محبت اور عقیدت کا ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے حضرتِ اقبالؒ کے الفاظ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ

اگر دانا دل و صافی ضمیر است — فقیرے با تہی دستی، امیر است

بدوشش منعمِ بے دین و دانش — قبائے نیست، پالانِ حریر است

باقی رہے ہم، سو

ننالم از کسے، می نالم از خویش

کہ من شایانِ شانِ تو نبودیم

طلوعِ اسلام)

ایک اہم سوال

بعض حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں اور انسانی طبائع ان پر غور و فکر کرنے سے اس لئے گریز کرتی ہیں کہ اس سے جن نتائج تک پہنچا جاتا ہے وہ خوش آئند نہیں ہوتے۔ لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے اپنے نتائج نہیں بدل دیا کرتی کہ آپ اس پر غور و فکر نہیں کرنا چاہتے۔ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور جب تک آپ اس کا بے نقاب تجزیہ کر کے، ان اسباب و علل کا ازالہ نہیں کرتے جو اس کا موجب ہیں، آپ اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتے خواہ آپ کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

آج ہم ایک ایسی حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر غور و فکر کرنے سے آپ کی طبیعت یقیناً گریز کرے گی، اس لئے کہ اس غور و فکر سے آپ لامحالہ جن نتائج پر پہنچیں گے وہ آپ کے لئے خوش آئند نہیں ہوں گے۔ لیکن ان نتائج و عواقب کی ہلاکت سامانیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس حقیقت پر غور و تدبر کو ٹالا نہ جائے۔ اگر اس پر اس سے پہلے غور کیا جاتا تو ممکن ہے اس وقت حالات ایسے خراب نہ ہوتے۔ اور اگر اس پر اب بھی غور نہ کیا گیا تو حالات یقیناً خراب تر ہوتے جائیں گے۔ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے بڑے گہرے مطالعہ اور تفکر کا محتاج ہے۔

آج دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کوئی چالیس کروڑ بتاتا ہے کوئی اس سے بھی زیادہ۔ تعداد کچھ بھی ہو لیکن حقیقت یہ کہ پاکستان بلکہ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک، زمین کے مختلف حصوں میں ان کی ایسی آبادیاں ہیں جو دیکھنے والے کو محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں یکسر آزاد حکومتیں بھی ہیں اور نیم آزاد بھی۔ محکوم بھی ہیں اور نیم محکوم بھی۔ خالص مسلمانوں کی آبادیاں بھی ہیں اور مخلوط بھی۔ یہ سب کچھ ہے۔ لیکن ان کی حالت کیا ہے؟

جو قابلہٗ آزاد مملکتیں ہیں وہ غیر مسلموں کی آزاد مملکتوں کے مقابلہ میں بہت کمزور بلکہ ذلیل ہیں۔ افغانستان، ایران، حجاز، شام، مصر وغیرہ حکومتیں یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں نہ صرف کمزور ہی ہیں بلکہ ان کا وجود درحقیقت ان کے رحم و کرم پر ہے۔ یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کی سیاسی مصلحتیں انہیں جس انداز اور جس حالت میں رکھنا چاہیں، انہیں ویسے ہی رہنا پڑتا ہے۔ یہ وہ انگور کی بیلیں ہیں جو ان شاہ بلوط کے درختوں کے

سہارے کھڑی ہیں۔ ان کی سیاست کی پتلیاں (داخلی اور خارجی ہر دو) ان کے اشارات ابرو پر ناچتی ہیں۔ گذشتہ جنگ عالمگیر میں ان میں سے ہر مملکت، ابھی اور دبکی ہوئی دن گذار رہی تھی اور اس طرح اقوام مغرب کی طاقتوں کے سائے میں پناہیں ڈھونڈ رہی تھی جس طرح چیل کے سائے سے ڈر کر مرغی کے بچے، مرغی کے نیچے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جنگ کے بعد دنیا کے اہم معاملات کے فیصلے یورپ اور امریکہ کے اکابر ثلاثہ (The Big Three) یا ابطالِ خمسہ (The Big Five) کے مشوروں ہی سے طے پا رہے ہیں جو غیر مسلم اقوام کے نمائندے ہیں۔ مسلم حکومتوں کو انہوں نے محض آراء شماری کے وقت اپنی تعویت تائید کے لئے پیچھے پیچھے لگا رکھا ہے۔ "اتحادِ اقوامِ اسلامی" (Pan-Islamism) کا جو ہوّا ایک عرصے سے غیر مسلم اقوام کے لئے ذہنی طور پر خوف و رعب کا باعث بن رہا تھا، اس کا بھانڈا فلسطین کے چوراہے میں اس بری طرح سے پھوٹا ہے کہ ہر ننگ حساس زمین میں گڑ گئی ہے۔ اُدھر انڈونیشیا میں دیکھئے۔ یورپ کے مٹھی بھر گوالے، سات سمندر پار سے آ کر، سات کروڑ مسلمانوں کا گلا ایسے آہنی پنجوں سے دبا رہے ہیں کہ ان کی آواز تک نہیں نکلنے پاتی۔ اس سارے خلفشار میں، صرف ترکی ایک ایسا ملک نظر آتا ہے جس نے اقوام مغرب کے مقابلہ میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ہے۔ لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو محض سنبھالے ہی رکھا ہے۔

ائمہ اقوام عالم میں اس کا بھی شمار نہیں۔ اس وقت قوموں کی امامت؛ اقوام یورپ اور امریکہ ہی کے حصہ میں ہے۔

مخلوط آبادیوں میں مثلاً روس کو لیجئے۔ وہاں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے لیکن وہاں کی حکومت کے کاروبار میں ان کا حصہ کہیں نمایاں نظر نہیں آتا۔ وہ بھی غیر مسلم روسیوں کے رحم و کرم پر ہی زندہ ہیں۔ حتیٰ کہ چین جیسا ملک، جو ممالک عالم میں نہایت پست درجہ میں شمار ہوتا ہے، وہاں بھی یہ حالت ہے کہ کبھی مسلمانوں کا نام ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ یورپ کے کئی ایک حصوں میں مسلمان (مخلوط طور پر) آباد ہیں۔ لیکن ننگ و تانہ حیات میں ان کے چرچے کبھی سنائی نہیں دیئے۔

اب اپنے گھر میں آئیے۔ کل تک مسلمان اور ہندو، ہندوستان میں انگریزوں کے محکوم تھے لیکن مسلمان انگریز کا بھی محکوم تھا اور ہندو کا بھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ہم اپنے آپ کو ہندوؤں سے بہت پیچھے پاتے تھے۔ آج بھی وہاں قریب چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان پر جو کچھ گذر رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ مملکت پاکستان بالکل نوزائیدہ ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے متعلق ابھی کوئی حتمی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہو۔ لیکن ہمارے انفرادی اور قومی خصائص و اوصاف تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اپنے متعلق کچھ نہ کچھ رائے تو قائم کر ہی سکتے ہیں۔ اور وہ رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

یہ ہیں وہ واقعات جن میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی!

اب آگے بڑھئے! مسلمانوں کی یہ آبادیاں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک دوسرے

ان کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں۔ آب و ہوا مختلف ہے۔ طرزِ بود و ماند مختلف ہے۔ زبانیں مختلف ہیں طبائع مختلف ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک ہے تو صرف ایک۔ یعنی ان کا مذہب۔

اب آپ یہ سوچئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصر، حالات کے اس تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوامِ عالم کے مقابل میں مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے، تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس میں ناک بھوں چڑھانے کی کوئی بات نہیں۔ لاحول پڑھنے کا کوئی مقام نہیں۔ اگر آپ کو تسلیم ہے کہ واقعات وہی ہیں جو اوپر لکھے گئے ہیں اور حالات ایسے ہی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس غیر مسلم کے اس سوال کا جواب ہمارے ذمے ہے۔ اس طبقہ کی طرف سے، جس نے ایک مدت سے حقائق سے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے، اس سوال کا (بزعمِ خویش) بڑا آسان جواب یہ دیا جائیگا کہ مسلمانوں نے چونکہ مذہب کو چھوڑ رکھا ہے اس لئے یہ اس درجہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ جواب خود انہیں تو مطمئن کر سکتا ہے، حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انھوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے تو غیر مسلم اقوامِ مغرب نے مذہب کو کونسا پلّے باندھ رکھا ہے۔ انھوں نے ان سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام اسقدر طاقتور ہیں، اور مسلم اقوام، دنیا کے ہر گوشے میں، کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنھوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا۔ ان کی حالت کونسی اچھی ہے!

یہ سوالات ایسے ہیں جو تاریخ و سیاست کے ہر طالبِ علم کے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان سے گھبرائیے نہیں۔ ان پر غور و فکر کیجئے۔ جب تک آپ ان پر آزادانہ غور نہیں کریں گے حقیقتِ حال تک نہیں پہنچ سکیں گے، اور جبتک آپ اصل حقیقت تک نہیں پہنچیں گے، اپنی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں گے۔

آپ سوچئے اور جو جواب آپ کی سمجھ میں آتے ہیں لکھ بھیجئے (لیکن مختصر طور پر لکھئے) سوچئے اور جواب لکھتے وقت اپنے دل میں کوئی چور نہ رکھئے۔ اس سے بالکل نہ ڈریئے کہ کوئی آپ کو کیا کہے گا۔ اپنے غور و فکر کا نتیجہ دوسروں کے سامنے آنے دیجئے۔ شاید اس طرح سے ہم اس حقیقت تک پہنچ جائیں جو ایک عرصے سے ہماری نگاہوں سے گم ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے ہمارا ہر قدم پیچھے کی طرف پڑ رہا ہے۔

طلوعِ اسلام ہر صاحبِ فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس اہم سوال پر غور کرے اور اپنے نتیجہ تدبر سے ہمیں اطلاع دے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان نتائجِ فکر کو بے کم و کاست شائع کریں اور آخر میں ان پر محاکمہ کر کے کسی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

باب المراسلات

(ترکہ اور وصیت)

ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

"آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے احکام ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کرلیں۔ لیکن اس باب میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ قرآن کریم انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے لیکن ان کی تقسیم کے لئے اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصے مقرر کرتا ہے جس میں تغیر و تبدل کا اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لیجیے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھایا پڑھایا ولایت تک پاس کرایا۔ اب وہ نہایت معقول ملازمت میں ہے۔ ہزاروں روپے کی آمدنی رکھتا ہے۔ خود صاحب جائداد بھی ہے۔ اس شخص کے دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس ننھے سے یتیم کی کفالت کے لئے ترکہ الگ کردیا جائے۔ لیکن اُسے اس پر کچھ اختیار نہیں۔ قرآن کی رُو سے بڑا بیٹا برابر کا حصہ لے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسی قسم کی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے پنجاب کی زراعت پیشہ اقوام نے زمین میں سے لڑکیوں کو حصہ دینا بند کردیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے۔ اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلہ پر کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصہ نکالئے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کسی کام کی نہ اس کے بیٹے کی۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا؟"

طلوعِ اسلام آپ نے جن دقتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ وراثت کے اس قانون کی پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آرہا ہے لیکن جو بدقسمتی سے یکسر قرآن کے خلاف ہے۔

یہ مشکلات اس بنا پر پیش آتی ہیں کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے (اور یہی ہمارے ہاں کا مروجہ قانونِ وراثت ہے) کہ کسی شخص کو اپنے مال اور جائداد میں وصیت کا حق نہیں۔ قرآن نے جو حصے مقرر کر رکھے ہیں اس کا ترکہ بالکل انہی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہ غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف۔ قرآن نہ صرف وصیت کی اجازت ہی دیتا ہے بلکہ اسے فرض قرار دیتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (۲/۱۸۰) مسلمانو۔ یہ بات تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آ گئی ہے اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہے تو وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں اُن کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا اس سے زیادہ واضح اور صریح حکم اور بھی کوئی ہو سکتا تھا! آیت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ "تم پر وصیت فرض قرار دی گئی ہے" اور انتہا اس پر کہ "یہ وصیت متقیوں کے لئے نہایت ضروری ہے"۔ پھر سورۂ مائدہ (آیات ۵/۱۰۶-۱۰۷) میں یہ تاکید آئی ہے کہ اس وصیت کے لئے گواہ بھی مقرر کئے جائیں اور ان گواہوں کی شہادت مشکوک نظر آئے تو پھر کیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لئے وصیت کی اجازت (بلکہ تاکید) ہے تو پھر قرآن کریم نے تقسیمِ وراثت کے حصے کس لئے مقرر کئے ہیں! اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں ہے اور ان آیات کے اندر جن میں وراثت کے حصے متعین کئے گئے ہیں۔ احکامِ وراثت سورۂ نسآء کے شروع میں آئے ہیں۔ آیات ۴/۱۱ تا ۴/۱۲ کو دیکھئے۔ پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱) "یہ حصے اس وصیت کے بعد تقسیم ہوں گے جو میت نے کی ہو یا جو کچھ اس نے قرض چھوڑا ہو اس کی ادائیگی کے بعد"۔ اس کے بعد پھر اور رشتہ داروں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ "یہ تقسیم وصیت کی تعمیل اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہو گی"۔ پھر تیسری مرتبہ بھی یہی ارشاد فرمایا ہے۔ اس کے بعد باقیماندہ حصوں کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر وہی ارشاد ہے کہ "یہ تقسیم میت کی وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہو گی"۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ (۴/۱۲) "یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے"۔ ان الفاظ پر احکامِ وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ بات کس قدر واضح ہے یعنی ہر مسلمان پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ اُسے اپنی جائداد و اموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح و مقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے اور جتنا جی چاہے دیدے۔ لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیت نہ کر سکا ہو یا اس کا ترکہ وصیت سے بڑھ جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم، اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑ دی بلکہ اس کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہی وہ حصے جو غیر متبدل ہیں۔

لیکن تقسیمِ جائداد کے اس اختیار کو بھی "بے لگام" نہیں چھوڑ دیا گیا کہ انسان مستحقین کو محروم کر دے اور اپنی جائداد کی تقسیم میں ناانصافی سے کام لے۔ اسی لئے جہاں وصیت اور قرضہ کا ذکر فرمایا وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ غَيْرَ مُضَارٍّ (۴/۱۲) بشرطیکہ وصیت اور قرضہ سے مقصود (حقداروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اگر کسی نے ایسا

کیا اب یہ احساس کا علم اس کی زندگی میں ہو گیا ہے تو جماعت کو حق دیا گیا ہو کہ وہ اصلاحِ حال کی صورت پیدا کر دے۔

فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ (۲:۱۸۲) اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بیجا رعایت کرنے یا کسی معصیت (بے انصافی) کا اندیشہ ہو تو (اسے چاہئے کہ) وہ (بروقت مداخلت کرکے اور وارثوں کو سمجھا بجھا کر) ان میں مصالحت کرادے۔

اور اگر یہ صورت اس کی موت کے بعد واقعہ ہو تو اس کی وصیت میں ضروری ردوبدل کر دیا جائے۔ لیکن یہ اختیار صرف اسلامی عدالت کو حاصل ہوگا، افراد کو نہیں۔

یہ ہیں وصیت (اور تقسیم ترکہ) کے بارے میں قرآن کے احکام۔ غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہیں یہ احکام۔ لیکن اس کے باوجود مقامِ صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلمہ" قانونِ وراثت کسقدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قانونِ وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے! اس قانون میں یا تو سرے سے وصیت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں۔ اور وہ بھی وارثین کے لئے نہیں۔ اور یا للعجب! کہ اس قانون کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ گرامی کی طرف جس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کی اتباع میں گذرا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ ہمارے مجموعہ روایات میں کسی طرح سے دو چار روایتیں اس قسم کی شامل ہو گئیں۔ اب رواۃ پرستی کا تقاضا تھا کہ ان روایات کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآنِ کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور خواہ اس سے حضورؐ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کی ذاتِ اقدس پر بھی طعن کیوں نہ آئے! آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم وصیت کو فرض قرار دے اور بلا مشروط، یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے (اور اس کی تاکید کرے)۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرمائیں کہ نہیں! وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔ خدا کے حکم میں ایسا ردوبدل، یقیناً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ اقدس کے سخت خلاف ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے ہاں یہ قانون موجود ہے اور صدیوں سے اس پر امت کا عمل ہوتا چلا آرہا ہے!

امید ہے آپ کے وہ شکوک اب رفع ہو گئے ہوں گے جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں فرمایا ہے۔ لیکن ایک بات قابلِ گذارش اور ہے۔ اور وہ زمین کے ترکہ کے ضمن میں ہے جس کا ذکر آپ نے اپنے خط کے آخری حصہ میں فرمایا ہے۔ قرآن کی رو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لئے زمین کی تقسیم وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کی تقسیم، ہر ضرورت مند کی ضرورت کے مطابق اسلامی حکومت کریگی۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت، اجارہ داری، زمینداری

یا تقسیم بطور ترکہ خارج از بحث ہے۔ (لیکن یہ سوال الگ ہے اور جداگانہ تفصیل کا محتاج)

آخر میں اتنی وضاحت اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مصالح اور مقتضیات کے مطابق جزئیات متعین کرنے کے لئے صرف انہی امور میں مجاز ہیں جن کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جن جزئیات کو قرآن نے خود متعین کر دیا ہے ان میں کسی کو ردوبدل کا حق نہیں۔ اور قرآن کریم نے اگر ان کے ساتھ خود ہی بعض شرائط بھی لگا دی ہیں تو ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے۔ (تقسیم وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیت کے ساتھ)۔

مکتوبات کے اہم نقاط

(۱) کیا مطلقہ عورت کے لئے زمانۂ عدت میں بھی تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت ہے تو زمانۂ عدت اور بعد از عدت میں فرق کیا ہوا!

طلوعِ اسلام طلاق کا فیصلہ کر دینے کے بعد سابقہ نکاح (معاہدہ) کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس لئے تجدید نکاح کی بہرحال ضرورت ہوتی ہے۔ زمانۂ عدت میں عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی (صرف اپنے سابقہ شوہر سے کر سکتی ہے)۔ عدت کے بعد اس پر اس کی کوئی پابندی نہیں رہتی۔ وہ جس سے چاہے شادی کرلے۔

---

(۲) قرآن کریم میں زنا کی سزا کے لئے سو کوڑے مذکور ہیں۔ لونڈی اور غلام کے لئے اس کے نصف۔ لیکن شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم (سنگسار) کی سزا بتائی جاتی ہے۔ رجم کا نصف کس طرح سے ہوگا؟

طلوعِ اسلام قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لئے نہ غیر شادی شدہ کے لئے۔ سنگساری کی سزا بعد کی وضع کردہ ہے اور اسے منسوب کیا جاتا ہے حضور رسالتمآب کی ذات گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے۔ کیا عرض کیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے دین میں کیا کیا کچھ داخل کر لیا ہے اور پھر ان چیزوں کو کس قدر مقدس بنا دیا گیا ہے!

---

(۳) پناہ گزین عورتوں کے لئے ایک سخت دشواری یہ ہے کہ ان کے خاوند لاپتہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کب تک مفقود الخبر خاوندوں کا انتظار کریں؟

طلوعِ اسلام یہ سوال درحقیقت مروجہ قانون سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ اس قانون کی رو سے شادی شدہ

عورت کا اور نکاح کر لینا یا اس کا نکاح کر دینا، جرم ہے۔ اب اگر کسی مفتی کے فتوے کی رو سے ایسا نکاح کر دیا گیا تو قانون اس فتوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا اور اس نکاح سے متعلق تمام افراد اس قانون کی زد میں آجائیں گے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور ہم حکومت پاکستان کے وزیر امور داخلہ سے گذارش کریں گے کہ وہ وقت کی ضرورت اور معاملہ کی نزاکت کے پیش نظر اس کا حل بہت جلد سوچیں اور قانونی فیصلہ سے اہل ملک کو آگاہ کریں۔ اس وقت بے شمار شادی شدہ عورتیں ایسی ہیں جن کے خاوند مفقود الخبر ہیں اور وہ بیچاری مصیبت کے دن کاٹ رہی ہیں۔

باقی رہا شریعت کا حکم۔ تو یہ حکم اس وقت متعین اور نافذ ہوگا جب یہاں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا۔ اسلامی مجلس آئین ساز موجودہ وقت کے مصالح کے پیش نظر جتنی مدت تک کا انتظار مناسب سمجھے گی وہی شریعت کا حکم قرار پا جائے گا۔

---

(۴) اگر عام مسلمانوں کو حق رائے دہندگی دیا گیا تو ان کی اکثریت دیہات میں بستی ہے اور دیہات میں سارا اثر نمبردار کا ہوتا ہے۔ اس وقت نمبردار سرکار کا مقرر کردہ ہوتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ نمبردار عام زمینداروں کے انتخاب سے مقرر ہوا کریں۔

طلوعِ اسلام | تجویز نہایت مناسب ہے۔ لیکن ایک نمبردار پر ہی کیا موقوف ہے بہت سے مناصب ایسے ہیں جن میں تعیناتی عوام کے منشا کے مطابق ہونی چاہیے۔ لیکن خدا جانے وہ دن کب آئیں گے۔ اس وقت تو جنہیں "منتخب شدہ" سمجھا جاتا ہے وہ بھی "منتخب شدہ" نہیں ہوتے۔

---

(۵) جب گالیاں تک دوسروں کو پہنچ جاتی ہیں تو مردوں تک ثواب کیوں نہیں پہنچ سکتا؟

طلوعِ اسلام | ہم اس دلیل کے سامنے واقعی لاجواب ہیں۔

مرا اے کاشکے مادر نزادے!

ایک گذارش | بعض احباب خطوط میں اپنا پتہ نہیں لکھتے۔ غالباً وہ متوقع ہوتے ہیں کہ ان کے خط کا جواب طلوعِ اسلام میں شائع ہوگا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام میں ہر خط کا جواب تو شائع نہیں ہو سکتا۔ لہذا آپ اپنا پتہ ضرور لکھ دیا کریں اور یہ بھی کہ اگر جواب طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے تو آپ کا نام درج کر دیا جائے یا نہ۔

نقد و نظر

اسلامی قانون

امیر جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اوائل ۱۹۴۸ء میں لا کالج لاہور میں دو تقریریں کی تھیں جو بعد میں ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئیں۔ اب مکتبہ جماعتِ اسلامی، لاہور نے انھیں ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا ہے جس کی قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ہے۔

مودودی صاحب کا اندازِ بیان بڑا سلجھا ہوا ہوتا ہے اور یہ خصوصیت ان تقاریر میں بھی موجود ہے لیکن خیالات میں وہی جمود۔ مثلاً وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اسلامی قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں۔

(۲) اصولی احکام جو قرآن اور ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

(۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ درحقیقت وہ چیز ہے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اب اس "اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ" میں سے قرآن کریم تو قطعی اور یقینی طور پر وہی ہے جو خدا نے نازل فرمایا۔ لیکن اس کا دوسرا حصہ یعنی "ثابت شدہ احادیث" کونسی ہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک "ثابت شدہ" ہیں۔ کیا کوئی ایسا مجموعۂ احادیث بھی اس آسمان کے نیچے موجود ہے جسے تمام مسلمان "ثابت شدہ" تسلیم کرتے ہوں؟ اور پھر اس کا ثبوت کیا ہے کہ وہ "ثابت شدہ" ہیں۔ مسلمانوں میں ہر فرقے کی الگ الگ "ثابت شدہ" احادیث ہیں جو باہدگر کیسر مختلف و متبائن ہیں لیکن اس کے باوجود انہی اصولوں کے مطابق "ثابت شدہ" جو دوسرا فرقہ اپنی احادیث کے "ثابت شدہ" ہونے کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ پھر ایک ایک مجموعہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جو باہدگر مختلف و متضاد ہیں۔ پھر ایک ہی فرقہ کے ہاں مختلف مجموعے، متضاد احادیث کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان سب میں مجموعہ امام بخاریؒ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہلاتا ہے۔ وہ رسول اللہؐ کے قریب اڑھائی سو برس بعد مدون ہوا۔ امام بخاریؒ نے قریب چھ لاکھ احادیث میں سے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کے قریب، اپنے اصولوں کے مطابق مسترد کر دیں اور باقی قریب چھ ہزار اپنے مجموعہ میں شامل کر لیں۔ اس مجموعہ میں ایسی ایسی روایات موجود ہیں جنہیں دیکھ کر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ کیا ان روایات کے مجموعہ کو اٹل اور

قطعی واجب الاطاعت" قرار دیا جا سکتا ہے؟ انہی مجموعوں میں شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دینا (ص۸۱) یا وصیت کے لئے ایک تہائی مال کی حد (ص۲۲۲) ایسے احکام ہیں جو قرآن کے صریح احکام کے خلاف ہیں۔ "ثابت شدہ" روایات صرف وہی کہلا سکتی ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو اور اس کے کسی اصولی حکم کی عملی فرع ہو جس سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس اصولی حکم پر عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کیسے عمل ہوا تھا۔

فقہ میں البتہ مودودی صاحب اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں لیکن اس میں بھی ایک استثنار کے ساتھ۔ یعنی "وہ اجماعی فیصلے جن پر تمام امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہو یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہو . . . تو وہ نظرِ ثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انھیں تمام مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔" (ص۳۹)

کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ وہ کونسے فیصلے ہیں "جن پر تمام امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے"؟ باقی رہے اکثریت کے فیصلے، سو دنیائے اسلام کی اکثریت تیرہ سو برس سے ملوکیت کو قبول کرتی چلی آ رہی ہے۔ کیا اس قسم کے فیصلے بھی نظرِ ثانی کے محتاج نہیں ہوں گے؟

یہ ہیں وہ خطوط جن پر اس اسلامی قانون کی تشکیل ہوگی جس کا مطالبہ اسلامی جماعت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے اور جس قانون کی رو سے جنگ کے قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا بھی جائز ہے، اور پھر ان لونڈیوں سے بلاتعیینِ تعداد تمتع بھی۔ (تفصیل اس کی طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں گذر چکی ہے)۔

مدراس کیلئے طلوعِ اسلام کی سول ایجنسی

چوہدری حاجی غنی مشتاق قریشی اینڈ سنز

محفوظ خان گارڈن سٹریٹ

جی۔ ٹی۔ مدراس

حقایق و عبر

سنہری خدمات؟

خواجہ شہاب الدین، وزیر داخلہ پاکستان نے ۱۲ فروری کو کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

> تقسیم ہند کے بعد سرکاری عملہ نے جس جانفشانی سے کام کیا وہ تاریخ میں جلی حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس پر قوم فخر کر سکتی ہے . . . . . متعدد موانعات کے باوجود ان کی طرف سے سرانجام دی ہوئی خدمات حسنہ پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے وزیر موصوف کو اس بے محل تبصرہ کی کیا ضرورت پیش آئی۔ تاہم جہاں تک محض تبصرہ کا تعلق ہے وزیر موصوف نے پہلی مرتبہ یہ حیران کن انکشاف کیا۔ ہم سرکاری عملہ کو مجموعی حیثیت سے ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان میں قابل عزت مستثنیات ہیں۔ لیکن عمومی اعتبار سے ان کی خدمات حسنہ کا صحیح احساس کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں کبھی نہ کبھی معمولاتِ زندگی میں ان سے واسطہ پڑا ہے۔ خوراک کا راشن، کپڑے کا راشن، مکانوں کی تقسیم، زمین کی تقسیم، متفرق سرکاری لائسنسوں کا اجرا، یہ سب ان کی "خدمات حسنہ" کی کھلی ہوئی دلیلیں ہیں۔ اس کے باوجود وزیر داخلہ اپنے عملہ کے کارناموں کو تاریخ میں جلی حروف سے لکھ رہے ہیں!

اس سرکاری عملہ کی پنجابی شاخ سے متعلق گورنر جنرل صاحب کی کیا رائے ہے؟ اس کا اندازہ اس اعلامیہ سے ہوتا ہے جو پنجاب میں آئین معطل کرکے پاکستان کیبنٹ سکریٹریٹ سے شائع ہوا۔ اس میں تحریر ہے:-

> گورنر جنرل نے مغربی پنجاب کے کوائف نظم و نسق سے پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کی ہے اور ان کا اضطراب دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ اب انھیں یقین ہو گیا ہے کہ ان کی مداخلت کا وقت آپہنچا ہے۔ رشوت ستانی نے بلاشبہ پبلک لائف کا معیار پست کر دیا ہے اور سازشوں نے ملازمتوں کا ضبط و نظم بگاڑ دیا ہے۔ حکومت صرف چند اشخاص کے مفاد کے لئے چلائی جا رہی ہے اور عوام کی توقعات اور ضروریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

یہ پنجاب کی حالت ہے اور اس کے لئے یہ گورنر جنرل کی شہادت ہے! سندھ میں مسٹر کھوڑو کا عہد حکومت ابھی داستانِ پارینہ نہیں بنا۔ الٰہی بخش کی وزارت کے کارنامے کس کو یاد نہیں؟ مگر اس وزارت نے وہ نہیں حاصل کرنے کے لئے

حکومتی اثر و رسوخ سے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ ان تفصیلات میں جانا تحصیلِ حاصل ہے!

مشرقی بنگال سے متعلق روزنامہ ڈان کے بنگالی مدیر کی رائے ملاحظہ کیجئے:۔

> سنتے ہیں کہ پاکستان سپیشل پولیس کے ایک افسر نے جو مشرقی بنگال کی شاخ کا انچارج ہے پچھلے دنوں کہا کہ اس صوبہ میں جو مرکزی حکومت کے محکمے ہیں، مثلاً، ریلوے، کسٹم، آبکاری وغیرہ وہ فساد نظم اور دیگر خباثت کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ مرکز کو کم و بیش چھ لاکھ روپیہ ماہوار کا خسارہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اگر جو کچھ سنا جاتا ہے وہ صحیح ہے تو خسارہ کا یہ اندازہ بہت کم ہے۔ ہمارے پاس یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ مرکز کے جن جن ذمہ دار حضرات نے صوبے کے ان ناگفتہ بہ حالات کو بچشم خود دیکھا ہے وہ کانپ اٹھے ہیں۔
>
> ہم پوچھتے ہیں کہ جب خود پولیس کو اعتراف ہے کہ مجرموں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے تو وہ کیوں انہیں اب تک گرفت میں نہیں لا سکی؟ (ڈان ۱۲ ؍)

یہ تو خیر ایک اخبار کا بیان ہے خود گورنر جنرل نے ۱۲ ؍ فروری کو مشرقی بنگال کا دورہ ختم کرنے کے بعد کراچی پہنچ کر فرمایا:۔

> لوگ (اس ہمہ گیر فساد) کا ذکر کر رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ صورت ایسی ناگفتہ بہ نہیں جیسے کہ بیان کیا جاتا ہے۔ بہرکیف پولیس کا محکمہ انسدادِ فساد موجود ہے اور وہ ملازمتوں کو (فاسد مادہ) سے پاک کر کے چھوڑے گا۔

ہم حیران ہیں کہ گورنر جنرل اور وزیرِ داخلہ کی متضاد شہادتوں میں سے کسے معتبر سمجھیں۔ ان حالات میں جو مورخ ان بیانات کو جلی حروف سے لکھے گا وہ یقیناً انہی طائفہ مجرمین کا سرخیل ہوگا!

۲۔ کمیونزم کا خطرہ

۱۲ ؍ فروری کو گورنر جنرل صاحب نے مشرقی بنگال میں ممکن کمیونسٹ خطرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ کمیونزم مشرقی بنگال میں گھر کر رہا ہے۔ البتہ یہ صوبہ میں سرگرم ضرور ہے۔ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کو اپنا پروپیگنڈے کا بہانہ بنا رہے ہیں . . . چونکہ اب مشرقی بنگال میں لگاتار چاول پہنچ رہے ہیں اس لئے اس پروپیگنڈہ کا نمایاں اثر نہیں ہوگا۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں اشارہ کیا تھا کہ مشرقی بنگال میں کمیونزم کی تعلیل کی جا رہی ہے اور غلط مفروضوں سے جی بہلایا جا رہا ہے۔ گورنر جنرل کے اس بیان نے ہماری رائے کو اور پختہ کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کو بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ چاول کے نرخ بحال ہو گئے تو کمیونسٹ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی عوام میں ہمہ گیر بے چینی اور بد اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ عوام حکومت و

ارباب حکومت سے مطمئن نہیں۔ پنجاب اور سندھ میں نام نہاد جمہوری نمائندوں نے جو مذموم مظاہرے کئے ان سے عوام اور برداشتہ خاطر ہو گئے ہیں۔ نظامِ حکومت عمومی اعتبار سے چند افراد کے فائدے کے لئے چلایا جا رہا ہے۔ کم از کم ڈیڑھ سال کے تجربے کے بعد عوام یہی سمجھنے لگ گئے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حالات ان کی حقیقی آزادی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اب ان کی جنگِ آزادی کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ وہ کل تک غیر کے غلام تھے اب اپنوں کے ہیں۔ اگر بغرضِ استدلال یہ کہا جائے کہ یہ ان کی غلط بینی یا غلط فہمی ہے تو اس کا کیا علاج کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں۔ جب تک عوام کی یہ بد اعتمادی اور دل برداشتگی کسی نہ کسی رنگ میں باقی ہے کمیونسٹ خطرہ دور نہیں ہو سکتا۔ چاولوں کی قیمت اعتدال پر آجائیگی تو بیسیوں اور مصیبتیں سامنے آجائیں گی، جو کمیونسٹوں کے لئے راہیں کشادہ کردیگی۔ کمیونزم آہستہ آہستہ کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اب اس سیلاب کا رخ ایشیائی ممالک کی سمت ہے۔ ایشیا کے سیاسی و اقتصادی کوائف کمیونزم کو دعوت دے رہے ہیں۔ ہندوستان اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ پاکستان ایک گونہ محفوظ ہے۔ یاد رکھئے ایک گونہ! اگر حکومت نے اس خطرہ کا کماحقہ احساس نہ کیا اور نظم ونسقِ حکومت کو بلند انسانی اقدار کے مطابق نہ چلایا تو چاول مہنگے ہوئے تو کیا اور سستے ہوئے تو کیا، وہ اس سیلاب کو نہیں روک سکے گی۔ چاول کی قیمت علامتِ مرض ہے، علتِ مرض نہیں۔ کمیونزم کہیں اپنے پاؤں نہیں جما سکتا جب تک اس کے لئے پہلے فضا نہ تیار ہو جائے۔ اور جہاں اس کے لئے فضا تیار کر دی جائے پھر اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ آپ کو معلوم ہے آندھی کس طرح آتی ہے؟ زمین کے کسی ایک خطہ میں شدتِ حرارت سے ہوا ہلکی ہو کر خلا پیدا کر دیتی ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے دوسری جگہ کی ہوا جھکڑ بن کر آجاتی ہے۔ سو آندھی آ نہیں سکتی جب تک کہیں خلا نہ پیدا ہو جائے اور جب خلا ہو تو پھر آندھی کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ کمیونزم کی آندھی بھی اسی طرح آیا کرتی ہے۔ ہم روزِ اوّل سے اس جگر خراش حقیقت کو دہرا رہے ہیں کہ پاکستان میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک خلا پیدا ہو چکا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کیجئے ورنہ بد نہاد قوتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھا جائیں گی۔ لیکن اس وقت تک اس کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یاد رکھئے۔ ان طوفانوں کا علاج لیپا پوتی سے نہیں ہو سکے گا جب تک حقائق کا بے نقاب مقابلہ نہیں کیا جائے گا ان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ سمجھ لینا کہ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کا بہانہ بنا رہے ہیں اور اس کے بعد یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ چونکہ اب وہاں چاول پہنچ رہے ہیں، اس لئے یہ خطرہ موہوم ہو گیا ہے، سکونِ فریب ہے۔ جب تک عوام کو عملاً محسوس نہیں کرایا جاتا کہ پاکستان ان کی خوشحالی کا حقیقی ضامن ہے اس وقت تک ان خطرات کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ یہی اس کا علاج ہے، اس کے سوا سب فریبِ نفس ہے۔ یاد رکھئے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

۳۔ زرعی موازنہ! مندرجہ ذیل ممالک میں گندم کی مقدار پیداوار فی ایکڑ کے حساب سے یہ ہے :۔

جرمنی ۔	۲۰۱۷	پونڈ (وزن)
جاپان ۔	۱۷۱۳	"
مصر ۔	۹۱۸	"
پاکستان ۔	۱۶۰	"

چاول کی پیداوار فی ایکڑ زمین کے حساب سے :۔

اٹلی ۔	۴۵۶۵	پونڈ
جاپان ۔	۳۴۴۴	"
مصر ۔	۳۰۰۰	"
پاکستان ۔	۱۴۴	"

اور روئی کی پیداوار :۔

مصر ۔	۵۳۵	"
پاکستان	۸۹	"

مندرجہ بالا اعداد و شمار دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ صرف ایک زراعت میں پاکستان کو ترقی کے کتنے مدارج طے کرنے ہیں!

۴۔ تعلیمی انقلاب! پاکستان تعلیمی مشاورتی بورڈ نے وزیر تعلیم پاکستان کی صدارت میں حال ہی میں پشاور میں جو قراردادیں منظور کیں ان میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ ناخواندگی کے خلاف ایسی مہم جاری کی جائے کہ مختلف صوبجات پاکستان میں خواندہ لوگوں کا تناسب آئندہ بیس سال کے عرصہ میں تیس فی صدی تک پہنچ جائے۔

یہ پاکستان کے عزائم ہیں۔ اس کے برعکس ترکی کا عمل ملاحظہ کیجئے۔ ۱۹۲۳ء میں جب جمہوریہ ترکیہ کا قیام عمل میں لایا گیا ناخواندوں کا تناسب ۸۵ فی صدی تھا۔ پرجوش اور انتھک ترکوں نے چند سالوں میں یہ تناسب ۸۵ سے ۲۵ فی صدی تک پہنچا دیا۔ گویا خواندوں کا تناسب ۱۵ سے ۷۵ فی صدی ہو گیا۔ خواندوں کے تناسب میں ساٹھ فی صدی کا اضافہ چودہ سال سے کم عرصہ میں ہو گیا۔ ترکی حکومت نے ہر ایک کے لئے بلا استثنا تعلیم جبری اور مفت کر دی اور ساری کی ساری قوم کو سکول بھیج دیا گیا۔

جو کچھ ترکی میں ممکن تھا وہ پاکستان میں ناممکن نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ کوئی مصطفےٰ کمالؒ موجود ہو۔

۵- ایک دلچسپ مقدمہ

مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے لئے شراب ممنوع قرار دی جا چکی ہے۔ پچھلے دنوں کسی مسلمان کے پاس شراب کی دو ایک بوتلیں پکڑی گئیں اور عدالت نے اسے قانونی سزا دیدی۔ اس سزا کے خلاف اس نے عدالت عالیہ میں مرافعہ دائر کیا اور ایک ہندو وکیل نے اس کی پیروی کی۔ وکیل نے کہا کہ پاکستان کے بنیادی آئین میں یہ درج ہے کہ کسی شخص کو محض مذہب کی بنا پر کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی لیکن میرے موکل کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر سزا دی گئی ہے۔ اگر یہ مسلمان نہ ہوتا (مثلاً ہندو یا عیسائی ہوتا) تو اس کے پاس شراب کی بوتل کی موجودگی کوئی جرم نہ تھا۔ لہٰذا اس کا یہ عمل محض مسلمان ہونے کی وجہ سے جرم بن گیا ہے جو پاکستان کے بنیادی آئین کے خلاف ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دلیل کیسی دلچسپ ہے۔

اور اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ اس دلیل کو قانونی میزان میں وقیع سمجھا گیا اور ملزم کو بری کر دیا گیا اور "قانون امتناع شراب" کو خلاف آئین پاکستان قرار دیدیا گیا۔ ہم عدالت عالیہ لاہور کے اس فیصلہ پر قانونی نقطۂ نگاہ سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر پاکستان کے بنیادی آئین کا مفہوم یہی ہے جو اس عدالت میں بیان کیا گیا ہے اور جسے اس عدالت نے صحیح تسلیم کر لیا ہے تو محض اس آئین کی موجودگی، مسلمانوں کو ہر قسم شرعی جرائم کی کھلی چھٹی ملنے دیدیتی ہے۔ یقیناً اس آئین کے واضعین کی یہ منشا نہ ہوگی۔ لیکن جب اس کا مفہوم یہی تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس آئین میں فوری ترمیم کی ضرورت ہے۔

بعض اوقات قانونی موشگافیاں کیسے دلچسپ نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ اور بعض وقت کیا؟ وکالت کا منصب ہی یہی ہے کہ وہ اس قسم کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں سے ایسی توجیہات نکالے کہ منشائے قانون منہ تکتا رہ جائے۔

پنجاب کی "اسلامی حکومت" نے لے دے کے ایک قانون پاس کیا تھا جس میں حد شریعت کا احترام تھا، وہ یوں ہنسی میں اڑ گیا۔

معجزات کی دنیا

علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کی شرح

(حکیم محمد حسین صاحب عرشی، دارالقرآن، لاہور)

ہمارے شاعر حکیم علامہ اقبالؒ کے بعض اشعار ایسے ہیں، جن میں ایک ایک شعر ایک ضخیم کتاب کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مثلاً

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

میرے سامنے جب یہ شعر آتا ہے، تو ساتھ ہی مقدمہ ابن خلدون کے سینکڑوں صفحات کی تفصیلات دماغ میں گردش کرنے لگتی ہیں ——— صرف مقدمہ کیا تاریخ عالم کے تمام ادوار بلکہ اقوام ماضیہ کی طویل داستان عروج و زوال اور ساتھ ہی ان حکومت پر ان کے طلوع و غروب کے اسباب و علل، سب کے سب اس ایک شعر میں سمیٹ لئے گئے ہیں۔ یہ ہے شاعر کی معجزانہ قدرت کلام۔

ایسا ہی ایک شعر یہ ہے جس پر ہم اس صحبت میں غور کریں گے۔

تیری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا

میں اس شعر کے الفاظ کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکتا ہوں تو مجھے توریت مجید اور قرآن حکیم کے اوراق شریف الٹتے پلٹتے اور کھلتے سمٹتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں، جن پر غیر فانی حروف میں قرون ماضیہ کی الہامی تاریخ مرقوم ہے۔ اس اسٹیج پر سب سے نمایاں پارٹ بنی اسرائیل نے ادا کیا اور معجزات کی دنیا سے اس قوم کو بہت زیادہ سروکار رہا۔ شاعر حکیم نے اپنے مصرع اولیٰ میں جو ابہامی قسم کا طنز چھپا رکھا ہے اس کا پہلا وار بھی اسی قوم پر پڑتا ہے تفصیلات میں جانے کی فرصت ہے نہ موقع، ہم صرف حضرت کلیم اللہؑ کے حالات پر اختصاراً نظر ڈالیں گے ——— آپ کی زندگی، ولادت سے وفات تک، اللہ تعالیٰ کے خاص تصرفات و معجزات سے معمور نظر آتی ہے۔ یہ تمام اعجازی واقعات پوری قوم کے سامنے ظہور میں آتے ہیں، قوم ان سے روحانی اور مادی طور پر متمتع بھی ہوتی ہے۔ لیکن غلامی کی طویل

مدت سے ان کی خودداری و خود اعتمادی کو اس قدر مجروح و مضمحل کر رکھا ہے کہ وہ اس عظیم الشان نبوت اور معجزات سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ یا معجزوں کی کثیر تعداد بھی انسان کے فقدان خودی کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اور اگر انسانی خودی اپنی صحت مندی کے ساتھ موجود ہے تو یہی سب سے بڑا معجزہ ہے جس کی طرف بہت سے ہنگامی معجزات خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں اور ایوان قومیت کے اجزائے تعمیر بنتے جاتے ہیں۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل بھی سن لیجئے۔

فرعون کا جور و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ بنی اسرائیل مقہوری و مغلوبی کے اس گڑھے میں گرا دیئے گئے ہیں جس سے زیادہ عمیق کوئی گڑھا نہیں ہو سکتا۔ کھلے بندوں تیغ و شمشیر کے زور سے اسرائیلی نسل کا خاتمہ کیا جا رہا ہے اب کوئی نہیں جو اس سرکش اور قاہر قوت کے آگے سر اٹھا سکے یا حرف فریاد لب تک لا سکے ــــ ایسے وقت میں

او چارہ کار بندہ داند
چوں ہیچ وسیلتش نماند

ارادہ الٰہی میں حرکت پیدا ہوتی ہے ــــ فرماتے ہیں۔

نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ
ونجعلھم الوارثین (قصص-۵)

ہم نے ان پر جو زمین میں کمزور کئے جا چکے تھے، احسان کرنے کا، اور ان کو زمین کا وارث بنانے کا
ارادہ کر لیا۔

اب کس کی ہمت ہے جو اس الٰہی ارادے میں حائل ہو سکے۔ یہ پہلا معجزہ ہے جو انسانی قوت سے بالاتر ہے۔

دوسرا معجزہ فرعون جس کے حکم سے بنی اسرائیل کے بچے ذبح کئے جاتے تھے، اسی کے گھر میں اس بچے کی پرورش کا انتظام کیا جاتا ہے، جو آگے چل کر اس ظالم حکومت کا خاتمہ کر کے بنی اسرائیل کو [illegible] آزادی سے ہمکنار کرنے والا ہے۔

حیرت اندر حیرت است

اس ایک معجزے کے ضمن میں کئی معجزے ہیں۔

۱ ــــ اگر وہ اپنے گھر میں رکھا جائے تو دوسرے ہم قوم بچوں کی طرح ذبح ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ اور اگر کسی طرح بچ بھی جائے تو اس ماحول میں غلامانہ ذہنیت سے متاثر ہونے کا قوی احتمال ہے۔ لہٰذا والدۂ موسیٰ کو وحی ہوتی ہے کہ

اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا
رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (قصص)

اس کو اپنا دودھ پلاتی جا۔ پھر جب خطرے کا وقت آئے تو اس کو دریا میں ڈال دے اور خوف و غم

سے آزادہ - ہم اس کو تیرے پاس واپس لائیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔

ب ــــ اغلب ہے کہ ایک ماں الٰہی وحی کو خواب وخیال سمجھ کر اپنے بچے کو دریا برد کرنے کی جرأت نہ کرسکے، لیکن ام موسیٰ کے دل کو وحی کے ساتھ ہی اس یقین سے بھر دیا جاتا ہے کہ اس کا بچہ بالکل محفوظ اس کو واپس مل جائے گا۔ چنانچہ اس نے دیر نہیں لگائی۔

ج ــــ فالتقطہ اٰل فرعون ــ وہی جن کے ہاتھ سے اسے ذبح ہونا چاہیئے تھا، اس کو دریا سے نکال لیتے ہیں۔ ان کی نظر میں مبغوض قوم کا بچہ محبوب بنا دیا جاتا ہے۔ ان ہی کے گھر سے قتل کی بجائے یہ آواز آتی ہے:

قرت عین لی ولک لا تقتلوہ (قصص ۹)

اے بادشاہ! یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کیجئے۔

سبحان اللہ العظیم مشیت ایزدی اپنے دشمن کے ارادوں میں داخل ہو کر اپنا کام کر رہی ہے، اور اسی کے گھر میں اس کے ہاتھوں سے اس کی تباہی کا سامان تیار کرا رہی ہے، لیکن وہ نہیں سمجھتا (وھم لا یشعرون)

د ــــ اب وہ اس کی پرورش کے لئے دودھ والیاں مہیا کر رہے ہیں، لیکن وہ ہے کہ کسی سے مانوس ہی نہیں ہوتا

حرمنا علیہ المراضع

اصل بات یہ ہے ہم (خدا) نے اس پر پہلے ہی انا ؤں کے دودھ بند کر رکھے تھے۔

ھ ــــ اب اخت موسیٰ جو دریا کے کنارے کنارے چلی آرہی تھی، ان کو اپنے گھر کی طرف رہنمائی کرتی ہے اس طرح وہ پھر اپنی ماں کی تحویل میں آجاتا ہے۔ اس کی آنکھیں ٹھنڈی اور غم دور ہو جاتا ہے۔

وعد اللہ حق ولکن اکثر الناس لا یعلمون (قصص ۱۳)

اللہ پاک کا وعدہ بالکل سچا ثابت ہوتا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

و ــــ اس پرورش میں اور بھی کئی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ چوری چھپے کہیں اپنے گھروں میں بچتا بچاتا پل بھی جاتے تو اپنی محکوم قوم کے غلامانہ ماحول میں رہ کر مصلحانہ جرأت کے اوصاف حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے اس کی تربیت کے لئے حاکمانہ ماحول فراہم کیا گیا۔ لیکن اس فرعونی حاکمیت میں خطرہ تھا کہ وہ جور و تشدد کا عادی بن جاتے۔ اس کا توڑ کرنے اور اعلیٰ انسانی صفات سے متصف بنانے کے لئے اندرون خانہ اس کو فرعون کی مومنہ بیوی کی آغوش تربیت کے سپرد کیا تاکہ وہ جوان ہونے تک جری اور نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ نیکو کاری کا سبق بھی سیکھتا رہے اس کے ساتھ ہی والدہ سے مربوط رہنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اپنی مظلوم و محکوم قوم کے درد و کرب سے بھی بے خبر نہ رہے۔

ولما بلغ اشدہ واستوی اتینٰہ حکما وعلما وکذلک نجزی المحسنین (قصص ۱۴)

اور جب وہ جوانی کو پہنچا اور پورا توانا ہوا تو ہم نے اس کو فہم سلیم اور علم سے نوازا۔ اور ہم نیکو کاروں کو

اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں ۔

یعنی مراتب عالیہ تک پہنچنے کا مقام ذریعہ الٰہی مشیت ہے، اس کے ساتھ ہی جذبوں کا نیک۔ عمل ہونا بھی اہم چیز ہے

نکتہ یہاں یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالے کے اعجازی تصرفات سے وہی لوگ مستفید ہوتے ہیں جن کے اعمال میں "احسان" کا پہلو غالب ہو، اور سعی وعمل سے حقیقی فائدہ ان ہی کو حاصل ہوتا ہے جو اپنی مساعی کو بُت بنا کر نہ پوجنے لگ جائیں - بلکہ فاعل حقیقی (عزاسمہ وجل ذکرہ) کی رحمتوں کا سہارا لیتے ہوئے میدان کار میں تیز خرام ہوں۔

ایک واقعہ ایک دن موسیٰ شہر میں داخل ہوتے ہیں، جبکہ لوگ ابھی سو رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ ایک سبطی اور ایک قبطی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ سبطی کی فریاد پر موسیٰ نے قبطی کے ایک مکا مارا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ حاکمانہ جسارت سے یہ کام کر تو بیٹھے، لیکن جلدی ہی احسان و تقویٰ کا جذبہ بیدار ہوا اور اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اعتراف خطا کیا اور اللہ تعالے سے معافی مانگی ۔۔۔ اگلی صبح ڈرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تو پھر اُس سبطی کو کسی دوسرے قبطی سے دست وگریبان پایا۔ اس کو ملامت کی اور قبطی کو پکڑنا چاہا، قبطی نے کچھ حیل وحجت کی، اتنے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا "اے موسیٰ! اکابر حکومت تمہارے قتل کے منصوبے باندھ رہے ہیں، اپنا بچاؤ کر لو"۔ موسیٰ اللہ تعالیٰ سے خلاصی کی دعائیں مانگتے ہوئے شہر سے نکل گئے ۔۔۔ فرعونی سرحد کو عبور کر جانے کے بعد ایک صاحب علم سے ملاقی ہوئے۔

تیسرا معجزہ یہ ملاقات بھی تصرف الٰہی سے خالی نہ تھی اس سے جناب کلیم کو آنے والے حالات کے لئے تیار کیا گیا ان میں جو ایک قسم کی حاکمانہ شدت اور عجلت پسندی تھی اس کو اعتدال پر لانے اور صبر وتحمل کی اہم دعائی صفت سے متصف کرنے میں یہ مختصر صحبت بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس مقام پر سات جگہ صبر کے ذکر کی تکرار ہوتی ہے (کہف ۶۸ تا ۸۲) میرے علم میں سارے قرآن میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی ۔ بعض لوگ تعلیم صبر کو باطنی چیز سمجھ کر خضر وموسیٰ کی ملاقات میں صوفیانہ اسرار ورموز تلاش کرتے ہیں، انہیں معلوم نہیں کہ قرآن کی رو سے کسی کشف وکرامت اور لطیفہ باطن کا مرتبہ صبر سے اونچا تو کجا اس کے برابر بھی نہیں۔ کئی جگہ صبر کو بڑے ہی ہمت کے کاموں میں بتایا گیا ہے۔

واصبر علیٰ ما اصابک ان ذالک من عزم الامور (وانشاءاللہ من الآیات) اونچے درجے کے پیغمبروں کی خوبی فرمائی ہے۔ (لقمان ۱۸)

فاصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل (احقاف ۔۔ ۳۴)

اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کرو۔

یہاں تک تو کہہ دیا ہے کہ اللہ تعالے تو اہل صبر کے سدا ساتھ رہتے ہیں (ان اللہ مع الصابرین) کیا اللہ تعالے سے بڑی کوئی دولت۔ نعمت یا قوت ہو سکتی ہے !

چوتھا معجزہ اب وہ مجمع البحرین کو عبور کر کے مدین میں جا پہنچتے ہیں۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی اعجازی نگرانی ان کے

سالہ ہے، وہاں ان کو نکاح اور سکونت کی آسائش کے ساتھ پورے دس سال تک ایک مرد صالح (شعیبؑ) کی متبرک صحبت میسر آتی ہے جس میں وہ بالکل کندن ہو جاتے ہیں، یہاں پہنچ کر ان کی وہ دعا بھی پوری ہوتی ہے جو انہوں نے شہر فرعون سے نکلتے وقت مانگی تھی۔

رب نجنی من القوم الظالمین (قصص ۲۱)
اے میرے رب مجھے ظالم قوم سے نجات دے۔

مرد صالح کے گھر پہنچ کر سرگذشت بیان کرتے ہیں تو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔

لا تخف نجوت من القوم الظالمین (قصص ۲۵)
مت ڈر تو نے ظالم قوم سے نجات حاصل کرلی۔

پانچواں معجزہ اب وہ وطن کو واپس ہوتے ہیں اور راستے میں مکالمہ الٰہی کی دولت سے سرفراز فرمائے جاتے ہیں۔

عجب است با وجودت کہ وجود من بماند
تو بگفتن اندر آئی و مرا سخن بماند

یہ نعمت غیر مترقبہ، یہ لذت قرب، اور یہ ساعت وصل اس غریب الدیار راہی کو نصیب ہوتی ہے، جو اپنے اہل سے کوئی خبر دریافت کرنے یا آگ سینکنے کے لئے دم بھر کو جدا ہوتا ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

چھٹا اور ساتواں معجزہ اسی پہلی صحبت میں ان کو دو معجزے دیئے جاتے ہیں: عصا اور ید بیضاء۔ یہ دونوں ان کے ربانی پیامبر ہونے پر برہان کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ فذانک برھانان من ربک۔

آٹھواں معجزہ یہ معجزے دے کر انہیں فرعون کے سامنے جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ گذشتہ واقعہ قتل کی بنا پر جھجکتے ہیں۔ انہیں بچاؤ اور غلبے کی بشارت دی جاتی ہے جو پوری ہو کر رہتی ہے۔

نواں معجزہ موسیٰ روانی تقریر کے وصف سے عاری ہیں اور تنہا اس بار عظیم کو اٹھانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے۔ ان کی یہ مشکلات بھی حل فرمائی جاتی ہیں۔ تقریر کی جرأت بخش دی جاتی ہے اور ہارونؑ کو دعوت و نبوت میں ان کا شریک و معین بنا دیا جاتا ہے۔

دسواں معجزہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دونوں بھائی دربار فرعون میں ہیں۔ مظلوم قوم کے دو بیچارے سامنے پورے مصر کی قوت و شوکت کا گھمنڈ اور ساز و سامان موجود ہے۔ ان کے اندر روح

وہی اپنا کام کر رہی ہے۔

لَا تَخَافَا اِنَّنِی مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی

اے موسیٰ و ہارون، مت ڈرنا۔ میں (خدا) تمہارے ساتھ ہوں (تمہارے مکالموں کو) سن رہا ہوں،

(حالات و واقعات) کو دیکھ رہا ہوں۔

سبحان اللہ العظیم۔ سبحان اللہ العظیم۔ موسیٰ بول رہے ہیں۔ حقائق و عبرت معمولہ تقریر کا سلسلہ جاری ہے۔ اور فریق مخالف کی طرف سے ذاتی حملوں اور لن ترانی طعنوں کے سوا کوئی بات بن نہیں پڑتی۔ دشمن زبان سے تہدید کی دھمکی بھی دیتا ہے لیکن تصرف الٰہی اس کو اس فعل سے

گیارہواں معجزہ باز رکھتا ہے۔

بارہواں معجزہ فرعون بہت بڑی کانفرنس طلب کرتا ہے، اپنی مملکت کے بڑے بڑے جادوگر فراہم کرتا ہے، اہل حق سے اور سحر کا اعجاز سے مقابلہ ہوتا ہے، باطل کے لشکر حق کے پہلے ہی حملے سے منہ کے بل ہو جاتے ہیں۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ ——— بھرے دربار میں فرعونی جادوگر موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے پروردگار کے حضور سر بسجود نظر آتے ہیں اور تخت فرعون کے سامنے فرعون کی خدائی کے پرزے اڑا رہے ہیں۔

تیرھواں معجزہ اب موسیٰ راتوں رات اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی فرعون بھی اپنی افواج کثیر کو لیے ہوئے آ پہنچتا ہے۔ اصحاب موسیٰ گھبرا جاتے ہیں کہ ہم پکڑے گئے موسیٰ ان کو اللہ تعالیٰ کی رفاقت کی بشارت سے مطمئن کرتے ہیں۔

اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ

میرا پروردگار یقیناً میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور اس آڑے وقت میں میری رہنمائی کرے گا۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی بحری راستہ جو بنی اسرائیل کے لیے نجات و حیات کا ذریعہ بنتا ہے، فرعونیوں کے لیے غرق و ممات کا سبب بن جاتا ہے۔

اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ

چودھواں معجزہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کو آزاد صحرائی زندگی میں تربیت دی جاتی ہے کھلے آفتاب کے نیچے سفر کی سوختوں کو ہلکا کرنے کے لئے ان پر بادل کے سائبان مہیا کیے جاتے ہیں، جو مناسب وقت تک ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ

ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔

پندرھواں معجزہ وہاں ان کے لئے کاشت کاری اور کسب معاش کا کوئی موقع نہیں۔ ضرورت ہے کہ

ان کو کارگاہ فطرت سے سہل الحصول خوراک عطا کی جائے۔

اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى

ہم نے تم کو من و سلویٰ سے نوازا

سولہواں معجزہ | پھر وہ ایک ایسے مقام میں جا پہنچتے ہیں جہاں پانی کی نایابی سب کی ہلاکت کا سبب بن جاسکتی ہے موسیٰ دعا کرتے ہیں وحی الٰہی ایسی جگہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے جہاں ستاسے فطرت نے پانی کے ذخیرے فراہم کر رکھے ہیں۔ جو ابل کر جاری ہو جانے کے لئے ضرب عصا کا انتظار ہی کر رہے ہیں۔

فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا

سو اس پہاڑ سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اس مختصر فہرست کے علاوہ اور بھی کتنے ہی معجزات و خوارق ہیں جو تورات و قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان سب کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں دشوار ہے:

اب ہم بعض ایسے واقعات بیان کریں گے جو بنی اسرائیل کی تائید میں فرعونیوں پر واقع ہوئے۔

تائیدی نشان | ۱- آل فرعون طویل خشک سالی اور پیداوار کے قحط میں مبتلا کئے گئے۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنين ونقص من الثمرات لعلهم يذكرون

(الاعراف ۱۳۰)

ہم نے آل فرعون کو برسوں کی خشک سالیوں اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا، مقصد یہ تھا کہ وہ نصیحت پذیر ہوں۔

۲- ان پر طوفان۔ ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کی مصیبتیں مسلط کیں۔ ہر مصیبت پر وہ ایمان لانے کا وعدہ کرتے اور اس کے ٹل جانے پر وعدہ توڑ دیتے۔

لیکن اتنے کثیر معجزات اور تائیدات کو دیکھتے ہوئے بھی بنی اسرائیل کا یہ حال ہے کہ اعتقادی فساد اور عملی بگاڑ کے ارتکاب سے باز نہیں آتے

بت پرستی | عبور بحر کے بعد راہ چلتے ہیں ایک قوم کو بت پرستی کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے پیغمبر سے ایک ایسا ہی بت (معبود) بنا دینے کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ الٰہی احسانات کو یاد دلا کر سمجھاتے بجھاتے ہیں۔

رویت اللہ | آگے چل کر "ارنی اللہ جہرۃ" کی شرط لگا دیتے ہیں کہ ہم تو جب تیری بات مانیں گے کہ اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔

گوسالہ پرستی | اس پر بھی بس نہیں کرتے۔ موسیٰ رسالت و کلام الٰہی سے مستفید ہونے کے لئے چالیس دن رات قوم سے الگ ہو کر خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں تو موقع کو غنیمت جان کر گوسالہ سامری کی شعبدانہ آواز سنتے ہی اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ واگزیدہ پرستش لیتے تو اس کو کتنا بڑا معبود مان بیٹھے (یہ ہیں وہ مدعیان وحدت؟)

کے اصحاب جن کی قومی تحریک کی اٹھان ہی معجزات ربانی کی گود میں ہوئی، جو سب سے بڑے اعتقادی گناہ شرک کی طرف بار بار دوڑ کر جاتے رہے ہیں۔

گاؤ پرستی — عام بت پرست قوموں کی طرح ان کا گاؤ پرستی پر اصرار بھی قرآن میں مذکور ہے۔ موسیٰؑ بحکم الٰہی ان کو بار بار ایک مخصوص گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں میکھ نکالتے چلے جاتے ہیں۔

انسان کشی — ذبح گاؤ میں ہچکچاہٹ اور قتل انسان بلکہ قتل انبیاءؑ تک میں بے باکی، کفر و طغیان اور انتہائی قساوت قلبی کی علامت ہے۔

واذ قتلتم نفسًا فادارءتم فيها

جب تم نے ایک شخص کو جان سے مار ڈالا پھر لگے اس کے بارے میں جھگڑنے

ثم قست قلوبكم ....

پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے۔ پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی سخت تر

يقتلون الانبياء بغير حق

انبیاءؑ کو بھی ناحق قتل کرتے رہے

ثم انتم هؤلاء تقتلون انفسكم وتخرجون فريقا منكم من ديارهم

تم اپنوں کا خون کرتے ہو اور اپنے لوگوں کو دیس نکالا دیتے ہو......!

حرص زندگی — بنی اسرائیل مدعی تھے کہ ہم خدا کی قوم ہیں، سب قوموں سے افضل ہیں۔ اس کے خلاف عملی حالت یہ تھی کہ دنیا میں غرق اور مادی زندگی کے سخت حریص تھے۔

احرص الناس على حيوة

سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی

اعمال — اس قسم کے عقائد و خیالات کا اعمال پر یہ اثر ہوا کہ قوم میں دنیا طلبی، بزدلی، مکاری اور عہد شکنی عام ہو گئی۔

ترک جہاد — موسیٰ احسانات الٰہی یاد دلا کر قوم کو جہاد کی دعوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی ارض مقدسہ پر قابض ہو جانے کی بشارت بھی سناتے ہیں۔ کہ اللہ نے یہ خطہ پاک تمہارے لئے لکھ دیا ہے لیکن خدا سے ڈرنے والے دو آدمیوں کے سوا ساری قوم نہایت گستاخانہ اور کافرانہ بزدلی کا مظاہرہ کرتی ہے

فاذهب انت وربك فقاتلا انا هٰهنا قاعدون

لے میرے پاس اس وقت فیروز اللغات موجود ہے اس میں یہ لفظ "میکھ" سے لکھا ہے

(اے موسیٰ) تو اور تیرا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔

سزا

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو فوز و فلاح اور عروج و کامرانی آج ہی کل میں حاصل ہونے والی تھی پورے چالیس سال پیچھے ڈال دی جاتی ہے۔ اناللہ۔

یک لحظہ غافل ماندم و صد سالہ راہم دور شد

فانہا محرمۃ علیہم اربعین سنۃ یتیہون فی الارض فلا تاس علی القوم الفاسقین ۝ (مائدہ ۲۶)

وہ مملکت ان پر چالیس سال کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔ اب زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے۔ سو (اے موسیٰ) تو ان فاسقوں پر رنج و افسوس نہ کر۔

تارکِ جہاد فاسق ہے

جہاد و قتال سے گریز کرنے والوں کو بارگاہِ الٰہی سے فاسق کا خطاب ملا۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں فاسق کا اطلاق کافر و منافق دونوں پر ہوتا ہے۔

من کفر بعد ذالک فاولٰئک ہم الفاسقون

اس کے بعد جو کفر کی راہ چلے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

ان المنافقین ہم الفاسقون

وہ جو منافق ہیں وہی فاسق ہیں۔

اب فاسق کی سزا بھی سن لیجئے۔

الذین فسقوا فماواہم النار

جو فاسق ہو گئے ان کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

جو لوگ جہاد بالسیف کو منسوخ یا حرام ٹھہراتے ہیں۔ ان کا اسلام ایک لاش ہے۔ جس پر زندگی حرام کر دی گئی ہے۔ قرآن کے تیس پاروں میں کم از کم ۶۰ مقامات پر جہاد اور اس کے متعلقات کا بیان اس زور و شدت سے کیا گیا ہے کہ اگر تمام آیاتِ جہاد کو جو سینکڑوں پر مشتمل ہیں، ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اسلام و جہاد ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔ مسلمان کے تمام جسمانی، روحانی اور اخلاقی اعمال و عبادات صرف اس بات کی تیاری ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے مولا پر قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ سب مل کر ایک تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اصل مضمون کے لئے جس کی سرخی جہاد ہے۔ ان نصوص کا انکار کر کے مسلمانی کا دعویٰ ایسا ہی ہے، جیسا کوئی شخص دوپہر کے وقت سورج کا انکار کرے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کرے کہ میری بینائی بالکل درست ہے۔ یاللعجب

مسخِ فطرت

منکرینِ جہاد، بزدل لوگ اگرچہ ایک چھوڑ دو سچے رسولوں (موسیٰ و ہارونؑ) کے اصحاب ہوں

اگرچہ شب و روز الٰہی تصرفات و معجزات سے نوازے جاتے ہوں، ان کا کسی رتبہ اعلیٰ پر پہنچنا تو درکنار وہ عام سطح انسانیت سے بھی گر جاتے ہیں۔

من لعنہ اللہ و غضب علیہ وجعل منہم القردۃ والخنازیر

ان ملعونوں اور مغضوبوں کو بندر اور سؤر بنا دیا، خواہ صورتاً ہوں یا سیرتاً

عبرت آپ نے دیکھ لیا " دنیائے معجزات " کے رہنے والے اسرائیلیوں نے " حادثات کی دنیا " سے بزدلانہ گریز کی، اس کے نتیجے میں قریب پہنچی ہوئی الٰہی برکات سے دور کر دیئے گئے، اس کے برعکس قوم یونس توبہ کی برکت سے قریب پہنچے ہوئے عذاب سے بچ گئے ـــــ قانون فطرت کسی قوم کی اس لئے رعایت نہیں کرتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ابراہیم کی نسل سے ہیں اور انہیں مسلسل نبیوں اور صحیفوں کے سبب اقوام عالم میں ممتاز کیا اور ان کے دشمنوں کو غیبی قوتوں سے پامال کیا گیا تھا ـــ جب اس ربانی قوم نے اپنے آپ کو الٰہی وعدوں اور آسمانی برکتوں کا اہل ثابت نہ کیا اور دنیائے حادثات سے منہ موڑ لیا تو ان کی پوری تاریخ ان کی بربادیوں اور ذلتوں سے بھرپور نظر آ رہی ہے ـــ آج جبکہ ہم پاکستانی مسلمان چاروں طرف سے دنیائے حادثات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے خصوصاً اور تمام عالم اسلام کے لئے عموماً یہ تذکرہ اپنے اندر عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک طومار رکھتا ہے۔

پاکستان کا معجزہ پاکستان کا وجود میں آنا ایک ربانی معجزہ ہے۔ ایسا نادر معجزہ جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم کے بے شمار مجلدات قاصر ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک تنہا انسان وہ زبردست قوموں کے مقابلے میں اٹھتا ہے، وہ قومیں جو حکومت، تجارت، تعلیم، سائنس، تنظیم، تعداد وغیرہ ہر لحاظ سے دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں ـــ اور وہ جس قوم کو ساتھ لے کر میدان مقابلہ میں اتر رہا ہے وہ کوئی قابل رشک حیثیت نہیں رکھتی۔ اس شخص واحد کو نہ صرف زبردست بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے بلکہ اپنی قوم، جس کے لئے وہ سر بکف ہے۔ اس کے اندر بھی لاکھوں بڑے بڑے بارسوخ آدمی اس کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، اُس وقت ہمارے نزدیک اس معجزہ ربانی کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ وہ شخص جس کے ذریعے سے اس کا ظہور ہو رہا ہے، کسی نبوت، مسیحیت، مجددیت، امامت وغیرہ کا قطعاً مدعی نہیں۔ وہ بڑے ہی ٹھوس اور بلند کیریکٹر کے باوجود مذہبی حیثیت سے سراپا انکسار نظر آتا ہے۔ اگر

---

[1] آج سے کچھ عرصہ قبل مختلف ممالک میں بعض لوگوں نے ایسے دعوے کئے لیکن وہ زندان غلامی سے نکلنے کے لئے ایک قدم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ بلکہ انہوں نے الٹا فرقہ بندی اور باہمی منافرت میں اضافہ کر کے ملت کے پیراہن اتحاد کو تار تار کر دیا۔ اور اسلام کے اہم بنیادی مسائل مثلاً حج، جہاد، ختم نبوت وغیرہ کا انکار کر کے زنجیر غلامی کو اور زیادہ مضبوط کرنے کا سبب بنے۔ بلکہ بعض نے تو جلی حروف میں غیر ملکی اور غیر مذہبی حاکم کی غلامی کو عین عبادت لکھ دیا۔ پاکستان کی خرابی یہیں سے ہے کہ صوبہ پرستی کے ساتھ فرقہ پرستی کی کمزوریوں کو بھی حکمت عملی سے بتدریج کم کر کے ختم کر دیا جائے۔

کبھی مذہب سے کوئی تعلق ظاہر کرتا ہے تو صرف اتنا اور اس پیرایہ میں کہ :-

"میں مسلمانوں کے لیئے الگ خطۂ زمین مانگتا ہوں جس میں رہ کر وہ قرآن عظیم کا قانون رائج کر سکیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو۔"

بس اس بات کو اس کا مذہب کہہ لیجئے، مطمحِ نظر سمجھ لیجئے، نصب العین زندگی تصور کر لیجئے ۔۔۔ وہ دنیائے حاضر کے بلند ترین دماغوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ جہاں ہمیں اس کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف کرنے والے بڑے بڑے لوگ دکھائی دیتے ہیں، وہاں اپنوں اور پرایوں میں اس کا مضحکہ اڑانے والوں کی بھی کمی نہیں۔ اس موقع پر ہمیں اس کے اٹل عزم و استقلال میں نطشے کے فوق البشر اور اقبال کی حقیقتِ منتظر کی روح جلوہ افگن نظر آتی ہے ۔۔۔ وہ پیکرِ خودی

"ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار"

۔۔۔ قوم کو الفاظ سے نہیں اپنے طرزِ عمل سے خودی کے غیر فانی اعجاز سے روشناس کراتا ہے۔ اس کی مستحکم خودی اغیار و اجانب سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔ عصرِ حاضر میں ملک گیری کے لیئے ضرورت ہے ہیبت ناک قوت و اقتدار کی، رعب افگن سپاہ و اسلحہ کی، طوفانی پراپیگنڈہ کی، مسلسل جھوٹے وعدوں اور مستقل مکارانہ چالوں کی ۔۔۔ سلاطین کی منڈی میں صدق و دیانت سکۂ ناروا اور حق و استحقاق لفظِ بے معنی ۔۔۔ اس کارگہ ابلیس میں اس مردِ خدا نے ان بازاری ہتھیاروں میں سے ایک بھی استعمال نہیں کیا۔ اس کی زندگی میں کر دار اس کی رحلت کے بعد زیادہ۔ اس کے دشمنوں نے بھی اس کی عظمتِ کردار کا اعتراف کیا۔ ایسے حالات میں کسی کور دل کے سوا کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے عظیم ملک (پاکستان) کا صرف دس سال کی قلیل ترین مدت میں وجود پذیر ہو جانا سماوی تائید کے بغیر واقع ہو گیا؟ دس سال جو قوموں کی زندگی میں ایک لمحہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشآء و تنزع الملک ممن تشآء

اے اللہ ملکوں کے مالک تو جسے چاہے ملک عنایت کرے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے

۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کامل یقین ہے کہ مالکِ کائنات جس کی اٹل مشیت نے ایسا غیر معمولی اور غیر متوقع انقلاب برپا کیا، اس کا کوئی فعل عبث نہیں۔ اس نے ایک نحیف جسم اور قوی دماغ سے پاکستان کی تخلیق اس لیئے نہیں کرائی کہ وہ محض ایک تاریخی مضحکہ بن کر رہ جائے۔ اور مسلمان پھر فراعنۂ زمان کے مظالم کا تختۂ مشق بن کر پسپتے رہیں۔ ہم سو فیصدی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ میں آج بھی وہی زندگی بخش نغمہ گونج رہا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے گونج چکا ہے۔

و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین ۝ (القصص ۵)

ہم نے ان پر جو زمین میں کمزور کئے جا چکے تھے۔ احسان کرنے کا اور ان کو زمین کا وارث بنانے کا ارادہ کر لیا۔

"لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا"

محترم مدیر "طلوع اسلام" کے الفاظ ذیل کو ستاروں کے حروف سے لکھ کر آسمان کے سینے پر آویزاں کر دو تاکہ روئے زمین کا ہر باشندہ اس حقیقت کبریٰ سے آگاہ ہو جائے جو ان میں پنہاں ہے۔

"پاکستان بنا ہے تو قائم بھی ضرور رہے گا، اس لئے کہ اگر خدا کی میزان میں ہماری تباہی مقدر ہو چکی ہوتی تو وہ ہم میں اقبال اور جناح کبھی پیدا نہ کرتا۔ فطرت اپنے ایسے گراں مایہ جوہروں کو ضائع ہونے کے لئے عطا نہیں کیا کرتی۔ اس لئے پاکستان جو اس مرد درویش کے تدبر کا ثمر ہے اور اس مرد کار کی تگ و تاز شب و روز کا نتیجہ ہے ضرور کامیاب و کامران رہے گا۔"

(طلوع اسلام ج ۱ نمبر ۱ صفحہ ۲)

انشاء اللہ العزیز

یہ کوئی شعر و مبالغہ کی بات نہیں کہ پاکستان سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور اس کی عظمت و رفعت کا صحیح اندازہ مستقبل کا دیدہ ور مورخ ہی لگا سکے گا۔ عصر حاضر کے پاکستانی اور غیر پاکستانی قدرتاً اس کی پوری اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

لیکن اس وقت ہمیں ان قرآنی تنبیہات سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیئے جو حدیث اسرائیل کے رنگ میں ہمارے سامنے رکھی گئی ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اسرائیلیوں نے آج تک ان مبارک تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، وہ کسی حد تک اس نامرادی کے لئے معذور بھی کہے جا سکتے ہیں، کیونکہ وہ اس کتاب تنبیہ (قرآن) سے بہت دور ہیں۔ لیکن مسلمان کے لئے کوئی عذر و مجبوری نہیں۔ وہ اس کو آسمانی پیغام، ابدی نور، محمدی اسوہ اور ہر دولت سے عزیز مانتا ہے۔

ھو خیر مما یجمعون

وہ (قرآن) اس دولت سے بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں

وقت ہے کہ ہم اسرائیلیوں کے حالات سے عبرت حاصل کریں۔ جس گڑھے میں وہ گرتے رہے ہیں اس سے بچ کر ہمیں حقائق کی دنیا سے غافل رہ کر معجزاتی نوازشوں میں کھو کر نہ رہ جائیں۔ یقین کیجیئے کہ سادی تائیدات اسی قوم کو نفع دیتی ہیں جو اصحاب محمد (صلعم) کی طرح متحد (اخوانا) آپس میں رحیم (رحماء بینھم) دشمن کے مقابلہ میں مضبوط (اشداء علی الکفار) ہو کر متحد کر سیسہ پلائی دیوار بنیان مرصوص، عدل و دیانت کے مجسمے (ان اللہ یحب المقسطین)

اور خلق عظیم کے پیرو (انک لعلیٰ خلق عظیم) ہوں۔

اللہ تعالیٰ بنفس نفیس ہر لحاظ پر ان لوگوں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں جو مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں۔ (ان اللہ مع الصابرین)، جو نماز کی ماہیت سے واقف ہو کر اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہوں۔ (انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ) زکوٰۃ کی برکات سے خزانہ سلطنت کو معمور رکھتے ہوں (واٰتیتم الزکوٰۃ) تمام رسولوں کی متفقہ تعلیم کو مان کر عملاً اس کے مؤید ہوں (اٰمنتم برسلی وعزرتموھم) ان کے اسرار عزیز کو بلند کرنے میں ایثار کوش ہوں (واقرضتم اللہ قرضاً حسناً)

قرآن مجید کی یہ تصریحات انسان کو حادثات کی دنیا میں عزت و فتح اور منصور رہنے کی سلامتیں بخشتی ہیں۔ ناممکن ہے کوئی قوم ان صفات سے متصف ہو۔ اور وہ ہر لحاظ سے مراتب عالیہ پر سرفراز نہ ہو سکے۔ اس وقت اگر ہمیں پاکستان کو مضبوط اور ممالک اسلام کیلئے حفظ و امان کا قلعہ بنانا ہے اور تشنہ دنیا کو کوثر اسلام سے سیراب کر کے حقیقی امن و سلام کی شاہراہ پر ڈالنا ہے تو ہمیں پکے پکے مسلمان بننا ہوگا۔ قانون فطرت ہمارے تساہل و تاخیر کا انتظار نہیں کرے گا۔ اگر اس وقت ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو نہ جانا۔ اپنی غفلت کی اور غلامانہ کردار و ذہنیت کو خیرباد نہ کہا تو جس طرح مغل حکومت کے زوال کا نتیجہ ڈیڑھ سو سال کی ذلت و رسوائی میں بھگتنا پڑا۔ اس سے کہیں سخت حالات کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (محمد ۳۸)

اگر تم حکم خدا سے روگردانی کرو گے تو وہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

بار الٰہا! پاکستان کے اکابر و اصاغر کو اس بروقت تنبیہ سے مستفید فرما۔ اور ہماری سطح بین آنکھوں کو ژرف نگاہی کی توفیق دے۔

(بقیہ رفتارِ عالم از صفحہ ۳۲)

مصر کے واقعات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ عوامی بے چینی جواب وہاں تفنگ سے ظاہر ہو رہی ہے، کسی وقتی یا ہنگامی واقعہ کے خلاف احتجاج نہیں بلکہ اس گہرے درد کی کسک ہے جس میں تنہا مصر ہی نہیں سارا عالمِ اسلام مبتلا ہے۔ اسی درد کا شکار ایران ہے۔ دوسرے ممالکِ اسلامیہ میں عوامی احتجاج ابھی منظم شکل اختیار نہیں کر سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کب تک ملتوی رہیگا؟ ملوکیت کی وہ لعنت جسے "غیر اسلامی" دنیا کب کی جھٹک چکی ہے، مسلمانوں کی دنیا پر بدستور مسلط ہے۔ تاریخ کا یہ کتنا عجیب واقعہ ہے کہ جو قوم شخصی اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی وہی آج اس کی سب سے زیادہ دلدادہ ہے۔ یہ نظام اب تک اگر زندہ ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ خود اس کے اندر اپنی بقا کا سامان موجود ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اسے کسی مخالف نظام سے متصادم نہیں ہونا پڑا۔ اگر چین کی حکومت (جو دنیا کی پانچ دول عظمیٰ میں شمار ہوتی ہے) قائم نہیں رہ سکتی تو غیر جمہوری ادارے بھی باقی نہیں رہ سکیں گے۔ چین نے پھر بھی مادی وسائل کے بل بوتے پر آخر تک مقابلہ کیا۔ ہماری "اسلامی" ملوکیتوں کے گھروندے ہوا کے ہلکے سے جھونکے کی تاب بھی نہیں لا سکیں گے۔ ان ملوکیتوں نے یہود کے مقابلے میں اپنی طاقت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے۔

کمیونزم کی آندھیاں مشرق و مغرب میں چل رہی ہیں۔ امریکہ دولت کے بل بوتے پر اقوام کو اپنے ساتھ ملا رہا ہے اور روس کمیونزم کے ہاتھوں انھیں "انقلاب" سے ہمکنار کر کے "آزادی" کا نیا مفہوم دے کر اپنا حلقہ بگوش کر رہا ہے۔ اس وقت بین الاقوامی سیاست "مشرق و مغرب" کی کشمکش کے محور پر گھوم رہی ہے۔ فلسطین اسی نکتہ کی تفسیر ہے۔ روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو مشرق وسطیٰ میں کم کرنے کے لئے امریکہ کی نگاہیں شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں پر ہیں۔ ۲۰ فروری کی اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ ٹریپولیٹینیا کی تولیت کا متمنی ہے تاکہ بحیرہ روم کے جنوبی ساحل پر وہ ایسا مستقر قائم کر سکے جہاں سے بمبار جہاز شمالی منطقہ عظمیٰ تک پہنچ سکیں۔ گذشتہ سال امریکہ نے اس تولیت کا خیر مقدم نہیں کیا تھا لیکن اب اس کی رائے بدل چکی ہے۔

مارشل سٹالین نے اپنے عزائم امن کا یقین دلانے کے لئے ایک اخباری نمائندے کی وساطت سے صدر ٹرومین سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تاکہ باہمی طور پر جنگ کا انسداد ہو سکے۔ ٹرومین نے ملنے پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن امریکہ کی حدود میں۔ روس نے مشرقی یورپ میں اس "قِران" کی خواہش ظاہر کی۔ بالآخر کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ روس امریکہ کے ہر اقدام کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور امریکہ روس کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں امریکہ پٹ رہا ہے اور کمیونزم کے سامنے وہ کئی محاذوں سے بے دخل ہو چکا ہے۔ مغربی یونین قائم کر کے اب شمالی اوقیانوس معاہدہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ناروے اور سویڈن کو عجیب مشکل کا سامنا ہے۔ ایک طرف روس کی رعب انگیز "دعوتیں" ہیں۔ دوسری طرف امریکہ کے سبز باغ۔ ترکی کے ساتھ بھی مذاکرات ہو رہے ہیں تاکہ اسے بھی "کونسل آف یورپ"

میں شریک کیا جاسکے۔ ترکی کا وزیر خارجہ حال ہی میں لندن جا کر برطانوی وزیر خارجہ سے اسی سلسلہ میں ملاقات کر چکا ہے۔

افغانستان مشرق و مغرب کی کشمکش کی آماجگاہ بنا جا رہا ہے۔ ۸ فروری کو امریکہ نے اپنا سفیر متعینہ افغانستان کو مشورہ کیلئے واپس واشنگٹن بلا لیا۔ اس کے ساتھ ہی افغانستان نے اپنے ان سفیروں کو جو لندن، دہلی اور کراچی میں متعین ہیں، مشاورت کیلئے بلا لیا ہے۔ یہ بھاگ دوڑ ان متضاد مطالبات کا نتیجہ ہے جو روس اور امریکہ کی طرف سے ان علاقوں پر اپنے متصادم مفادات کو محفوظ کرنے کیلئے پیش کئے جا رہے ہیں۔ روس نے تاشقند میں جو شمالی سرحد افغانستان سے قریب ہے ایک ایٹمی توانائی کا کارخانہ قائم کیا ہے۔ اس سے امریکہ قدرتی طور پر اور مضطرب ہو گیا ہے۔

سٹالین کی دعوتِ ملاقات کے بعد روس نے مجلس تحفظ میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ پانچوں بڑی طاقتیں فوری طور پر ایک تہائی افواج کم کر دیں اور ایٹمی جنگ کو ممنوع قرار دیا جائے۔ اس شک کی بنا پر جو دول مغرب کو روس کے عزائم سے متعلق ہے اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ تیسری جنگ کی باتیں عام ہو رہی ہیں اور دنیا "مشرق" اور "مغرب" میں تقسیم ہوتی جا رہی ہے۔ اس وقت ہر حکومت کے سامنے یہ سنجیدہ سوال ہے کہ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے کس صف میں شریک ہو سکتی ہے۔ اس "جنگ صفین" سے علیحدگی خارج از بحث ہے۔

حکومت ہند نے بالآخر سکھوں سے سختی برتنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈال کر اب وہ فارغ ہو گئی ہے کہ سکھوں کی طرف توجہ دے سکے۔ ۱۹ فروری کو ماسٹر تارا سنگھ کو دہلی جاتے ہوئے حراست میں لے لیا گیا اور نامعلوم جگہ نظر بند کر دیا گیا۔ تارا سنگھ کا عزم دہلی آل انڈیا اکالی دل کے ساتویں سیشن کے سلسلہ میں تھا۔ پہلے تو پنڈت نہرو نے ذاتی خط کے ذریعہ تارا سنگھ کو اس اجلاس کے انعقاد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ نہرو کے الفاظ میں دہلی میں "شدید کشیدگی" پائی جاتی ہے۔ لیکن تارا سنگھ کی ضد دیکھ کر حکومت نے گرفتاری کا اقدام کیا۔

حکومت نے سکھوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور تمام نیشنلسٹ سکھوں کو اپنے ساتھ ملا کر سرکاری عہدوں کے سبز باغ میں الجھا دیا ہے۔ اس مطمئن طبقے کا حکومت کے خلاف اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے طبقے کو اس کمزوری کا احساس معلوم ہوتا ہے چنانچہ سکھوں سے کوئی اضطراری احتجاج بن نہیں پڑا۔ دہلی میں زیادہ سے زیادہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سکھ ۲۰ مارچ کو یوم احتجاج منائیں گے اور ہڑتال کریں گے۔ حکومت غور کر رہی ہے کہ تارا سنگھ کو جلدی رہا کر دے تاکہ سکھوں کے احتجاج کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ یہ نزاع کیا صورت اختیار کرتی ہے اس کا اندازہ چند دنوں میں ہو جائیگا۔

---

۱۹ اور ۲۰ فروری کو کراچی میں آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں نیا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ نئی مسلم لیگ کا نیا صدر چودھری خلیق الزماں کو منتخب کیا گیا ہے جنہیں تنظیم جدید کا ناظم مقرر کیا گیا تھا۔ جناب ناظم نے اول سے آخر تک انتخابات کو اس قالب میں ڈھالا کہ اس کا نتیجہ حسب خواہ نکلا۔ مسلم لیگ کی روش اور ترکیب سے متعلق عوام میں عام بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے کے لئے وقت درکار ہے۔

پاکستان کی معیاری صحافت کا ترجمان

غالبؔ

ہفت روزہ کراچی

مستقل عنوان

- بین الاقوامی سیاسیات پر تبصرے۔
- دارالخلافہ (کراچی کی سیاسی و سماجی زندگی پر ہفت روزہ تبصرہ)
- ہندوستان ہمارا (ہندوستان کی سیاست اور سماجی حالات کا دلچسپ عکس)
- تگ و تاز (مزاحیہ کالم)
- افسانے (پاکستانی رنگ میں ڈوبے ہوئے افسانے)
- خواتین کے متعلق کارآمد مضامین۔
- کراچی کی ادبی سرگرمیاں۔
- پاکستان کے متعلق بصیرت افروز مقالے۔
- پاکستان کے دستورِ اساسی پر مباحث

منظومات و دیگر مضامین و مقالات۔

قلمی معاونین خصوصی

ڈاکٹر عبدالحق صاحب۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر صاحب .... آغا محمد اشرف صاحب۔ ڈاکٹر عارف صاحب بٹالوی۔ سید محمد تقی صاحب (جنگ)۔ علامہ اسلم جیراج پوری۔ غلام محمد بٹ۔ اسد ملتانی۔ بیخود دہلوی۔ حیرت شملوی۔ ہوش تیموری۔ ظفر آصف۔ حسنین کاظمی۔ منصور معجز ایم۔ اے۔ قیسی رامپوری۔ رئیس احمد جعفری۔ صادق الخیری وغیرہ وغیرہ۔

مدیرِ اعلیٰ۔ رئیس امروہوی

قیمت فی کاپی چھ آنے۔

اپنے شہر کے ہر نیوز ایجنٹ سے طلب فرمائیے

اسلامی حکومت

محمد علی جناح (آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر، پاکستان کے گورنر جنرل اور ملتِ اسلامیہ ہندیہ و پاکستانیہ کے قائدِ اعظم):-

میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت ہی کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں۔ (جب مسلمان اپنے لئے آئین بنائیں گے تو وہ آئین شریعت کے علاوہ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا)۔ اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔ (کراچی میں ۲۵ [illegible] کو تقریر)

چودھری خلیق الزماں (مہاجر ہند، ناظم مسلم لیگ پاکستان اور آل پاکستان مسلم لیگ کے نئے صدر لہٰذا قائدِ اعظم صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے جانشین):-

(یہ صحیح ہے کہ) شریعتِ اسلامی ہماری منزلِ مقصود ہے اور پاکستان کا قیام اسی لئے عمل میں آیا ہے (لیکن) قرآنی احکامات کا نفاذ ایک ایسی اسلامی سٹیٹ میں ہو سکتا ہے جو تمام دنیائے اسلام پر حاوی ہو۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی جو قومی سلطنتیں ہیں وہ صحیح معنوں میں قرآنی یا اسلامی نہیں بن سکتیں۔ (۱۲ [illegible])

مسٹر لیاقت علی خاں (آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، قائدِ اعظم کے دستِ راست اور پاکستان کے وزیرِ اعظم):-

مسلم لیگ سے میرا تعلق جسم و جان کا تعلق ہے۔ میں گذشتہ پچیس سال سے اس کا رکن چلا آرہا ہوں۔ میں لیگ کونسلر کی حیثیت سے بول رہا ہوں۔ حصولِ پاکستان سے پیشتر ہم نے جو وعدے مسلم قوم سے کئے تھے انہیں پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ (ہی) اس لئے کیا تھا کہ ایک ایسا خطۂ ارض میسر آجائے جس پر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی تقدیر کی تشکیل کر سکیں۔ ہمیں ایک تجربہ گاہ کی ضرورت تھی، ایک ایسی حکومت کی ضرورت تھی جو اسلامی اصولوں پر کاربند ہو۔ ایسی حکومت جو دنیا میں بہترین ہو۔ آپ کے سامنے قائدِ اعظم کی مثال موجود ہے۔ میری تمنا ہے کہ آپ ان کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ (۲۱ [illegible]) (مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر جس کی صدارت چودھری خلیق الزماں نے فرمائی)

چودھری خلیق الزماں:- قائدِ اعظم نے ملت کی رہنمائی کے لئے جس شمع کو روشن کیا تھا ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے روشن رکھیں۔ مسلم لیگ کا نصب العین حصولِ پاکستان (ضرور) تھا (لیکن) اس نے کوئی ایسا باضابطہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ قوانینِ شریعت کا نفاذ کرے گی۔ (۲۶ [illegible]) (جہاں تک قرآنی حکومت کے قیام کا تعلق ہے اس کے متعلق میرا نظریہ تو یہ ہے کہ) جب تک تمام دنیائے اسلام ایک وحدت نہیں بن جاتی اس پر

قرآنی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مسلمانوں نے پاکستان کو اسلامی سلطنت بنانا شروع کر دیا تو (عالمگیر) وحدتِ مسلمہ پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔ (ڈان کی اشاعت ۹ جولائی میں مضمون اور ۲۱ جولائی کو تقریر)

مسٹر لیاقت علی خاں:۔ ہم نے مسلم قوم سے وعدے کر رکھے ہیں جنہیں ہم کسی طرح بھول نہیں سکتے۔ ہزاروں مسلمانوں نے اس نصب العین کی خاطر اپنی جانیں دی ہیں۔ قریباً ستر لاکھ مسلمان گھر بار ترک کر کے اور گوناگوں مہالک و مخاطرے گزر کر اسی نصب العین کے حصول کی خاطر پاکستان آئے ہیں۔ ہمیں اب اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہوگا اور (پاکستان) میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کا قیام کرنا ہوگا۔ (۲۱ جولائی)

چودھری خلیق الزماں:۔ (یہ کیسے ہو سکتا ہے؟) قرآن نے "یا ایہا الذین آمنوا" کہہ کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلامی سٹیٹ ساری ملتِ اسلامیہ کے لئے ہونی چاہیئے، نہ کہ جغرافیائی، نسلی یا علاقائی وحدتوں کے لئے۔ (جیسا میں نے عرض کیا ہے) اگر مسلمانوں نے پاکستان، مصر، سعودی عرب، شام، عراق، ایران، ترکی یا افغانستان جیسے ممالک کو اسلامی سلطنتیں بنانا شروع کر دیا تو (عالمگیر) وحدتِ مسلمہ پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔ (۹ جولائی)

سمجھوتہ

مسٹر لیاقت علی خاں:۔ پاکستان کو ہمیں اسلامی قالب میں ڈھالنا ہے۔ (اس کے لئے) ہمارے پاس ایسی سیاسی جماعت ہونی چاہیئے جو اسلام اور اس کے موقف کو کما حقہٗ سمجھے (اور ہم اس کی مدد سے اسلامی سٹیٹ قائم کر سکیں)۔ (لہٰذا) آج مسلم لیگ کی ضرورت پہلے سے بھی اشد ہے۔ (۲۱ جولائی)

چودھری خلیق الزماں:۔ (کون انکار کر سکتا ہے کہ) مسلم لیگ کی خدمات بے پناہ ہیں، اور اسے زندہ رکھنے کا فریضہ ہم میں سے ہر ایک پر عائد ہوتا ہے۔ جیسے ہمارا فرض ہے کہ ہم پاکستان کا تحفظ کریں اسی طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم پورے خلوص سے مسلم لیگ کو زندہ رکھیں اور اسے قومی بنائیں۔

میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے ہر ضرورت کے موقع پر میری امداد فرمائی ہے (۹ جولائی)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

معاملات کی ضروری باتیں

(۱) طلوعِ اسلام کا ایک ایک پرچہ، پڑتال کر کے، پوری احتیاط سے ڈاک خانہ میں دیا جاتا ہے۔ رجسٹری شدہ بھی اور غیر رجسٹری شدہ بھی۔ اس لئے اگر آپ کا پرچہ آپ تک نہیں پہنچتا تو اپنے مقامی ڈاک خانہ والوں کو تاکید کیجئے اور افسرانِ بالا تک اس کی شکایت پہنچائیے۔ رجسٹری شدہ پرچہ کے نہ پہنچنے پر ہمیں لکھئے تاکہ ہم آپ کو رسید رجسٹری کا نمبر بھیجدیں۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ والا لفافہ بھیجئے۔ اس کے بغیر تعمیلِ ارشاد نہ ہو سکے گی۔

(۳) طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ دس روپے ہے۔ اگر پرچہ بصیغۂ رجسٹری منگانا ہو تو سال بھر کے لئے تین روپے (کل تیرہ روپے) ارسال فرمائیے۔ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے۔ وی۔پی طلب نہ فرمائیے۔

(۴) ہر موصول شدہ رقم کے لئے چھپی ہوئی رسید بھیجی جاتی ہے۔ جس رقم کی رسید آپ کو نہ ملے اس کی رسید طلب فرمالیں۔ بغیر رسید کے رقم وصول شدہ تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اسے نوٹ کر لیجئے۔

(۵) اگر آپ کو معاملہ کے سلسلہ میں کوئی شکایت ہو تو پہلے وجہ دریافت فرمائیے اور اگر وہ اطمینان بخش نہ ہو تو پھر بیشک خفا ہو جئے۔ اس سے پہلے نہیں۔

(۶) آپ کو معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام آپ ہی کا پرچہ ہے؟

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

آرام باغ روڈ — کراچی